BROWN BOOKS

سفرنامہ ازبکستان

امام بخاری

کے ملک میں چند روز

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

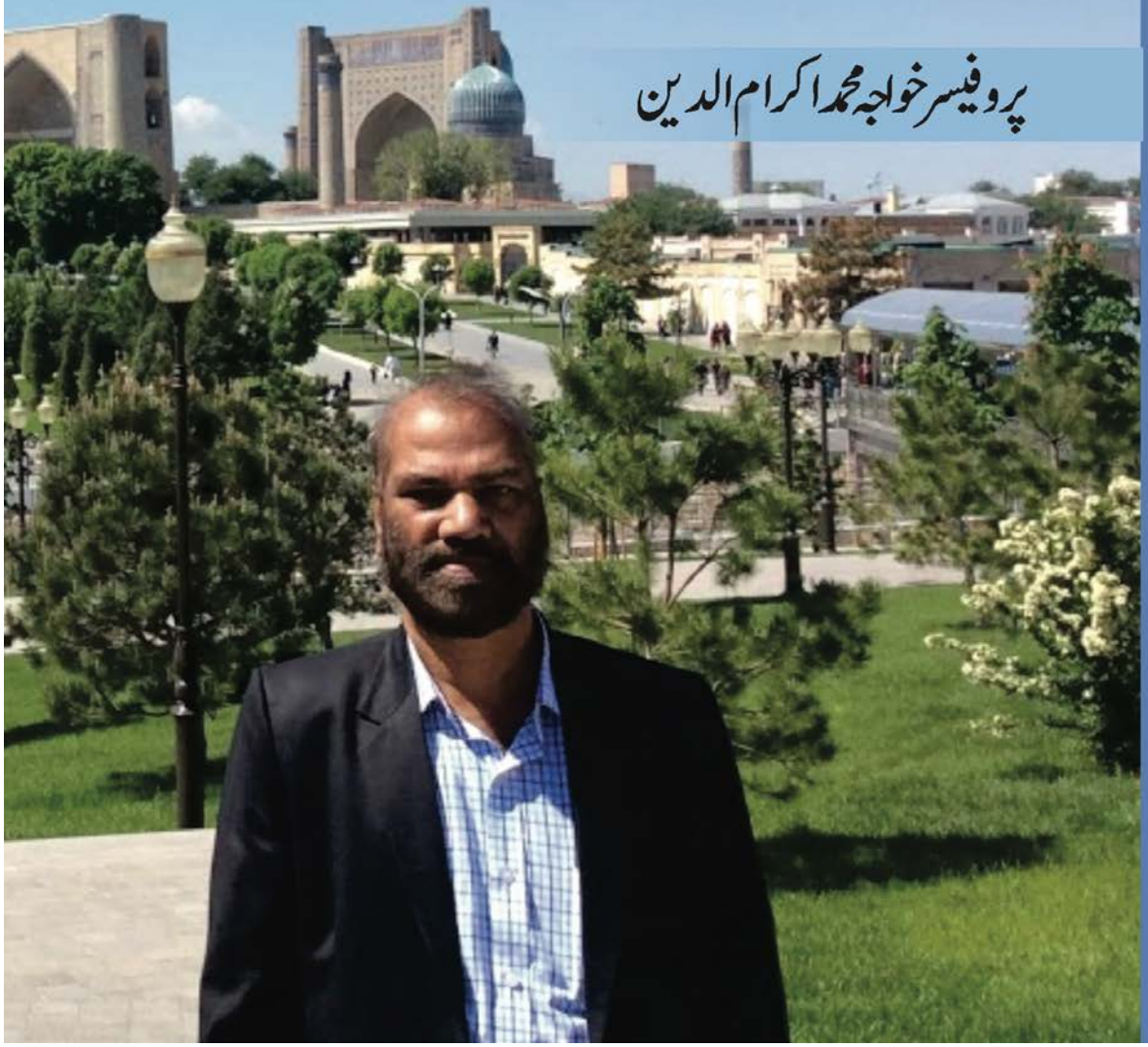

امام بخاری کے ملک میں چند روز

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

B

Travelogue Uzbekistan

Few days in the Country of
Imam Bukhari

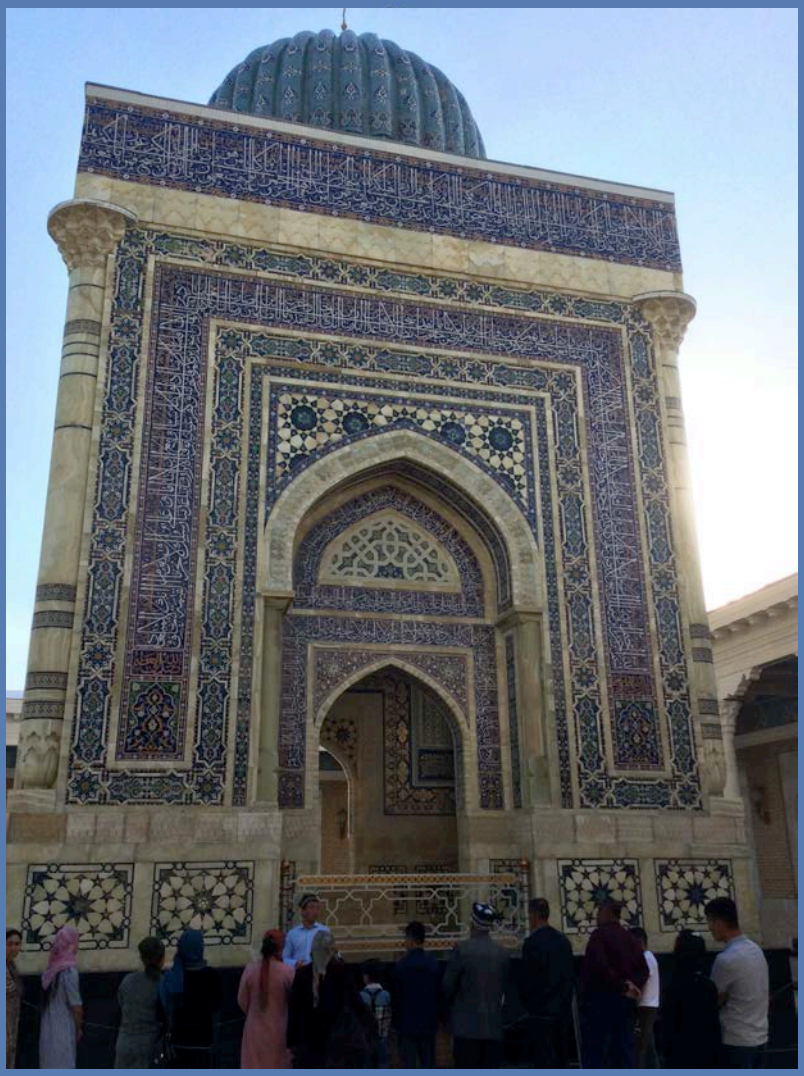

BROWN BOOKS
Opposite Blind School, Qila Road,
Shamshad Market, Aligarh-202001
Mob: +91-9818897975, Ph:0571 2700088
E-mail: bbpublication@gmail.com
Website: www.brownbooks.in
₹ 300/-

کاپی رائٹ: نجمہ اکرام

نام کتاب: امام بخاری کے ملک میں چند روز
ڈیجٹل ایڈیشن
جون 2019
سفحات
زیر اہتمام: ورلڈ اردو ایسوسی ایشن
براؤن بک، نئی دہلی
کتاب کی حصولیابی
www.khwajaekram.com
www.worldurduassociation.com

مصنف:
پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی

پیش لفظ

ازبکستان دیکھنے کا شوق بہت زمانے سے تھا لیکن اسے اتفاق کہیے کہ ڈاکٹر محیا عبدالرحمانو، استاد تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز نے بہ حیثیت وزیٹنگ پروفیسر کے بلایا اور مجھے پندرہ دنوں تک قیام کا موقع ملا۔ اس سفر میں وہاں کی علمی وادبی ماحول کو دیکھا۔ اردو، ہندی اور فارسی کے اساتذہ اور طلبہ وطالبات سے ملاقاتیں بھی ہوئیں اور وقت نکال کر تاشقند، سمرقند اور بخارا کو بھی دیکھا۔ چونکہ یہ ملک مجھے بہت پسند ہے اسی لیے ایک ایک یادداشت کو قلمبند کرتا گیا اور سفر نامے کی صورت میں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اس سفر نامے میں تعلیمی احوال اور ازبکستان میں بزرگان دین کی زیارت گاہوں پر میرے تفصیلی تاثرات ہیں۔ اس ملک کو کئی حوالوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن میرا زاویۂ نظر یہی تھا۔

تاشقند کے اساتذہ اور میرے عزیز طالب علموں کا شکریہ جنھوں نے مہمان نوازیوں سے میرا دل جیت لیا۔ اللہ ان سب کو سلامت رکھے۔ (آمین)

نئی دہلی
پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

جون 2019

امام بخاری کے ملک میں چند روز

24 اپریل سے 11 مئی 2019تک

ازبکستان کو موجودہ دور میں کئی اعتبار سے شہرت اور اہمیت حاصل ہے لیکن اگر عقیدت کی بات کی جائے تو اس ملک کو اولیاء، صوفیا، انبیاء کا ملک کہا جاتا ہے ان کی نسبت ہی اس ملک کے لیے بہت کافی ہے اسی ملک سے حضرت امام بخاری کا بھی تعلق ہے اور میرے نزدیک یہ تمام نسبتیں ملک ازبکستان کے لیے بہت اہم ہیں۔ازبکستان کو دیکھنے کی تمنا میرے دل میں انہیں نسبتوں کے سبب تھی۔اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے یہ سعادت تعلیمی سفر کے طور پر عطا کی۔

ازبکستان کا ایک شہر جسے دنیا میں کافی شہرت حاصل ہے۔یہ شہر اسلامی ملکوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس شہر کا نام ''بخارا'' ہے۔یہ ازبکستان کا پانچواں بڑا شہر ہے۔دنیا کے قدیم ترین شہروں میں اس کا نام لیا جاتا ہے۔بخارا قدیم تہذیب کا نمائندہ شہر ہے۔بخارا کے ساتھ سمرقند کا بھی نام لیا جاتا ہے لیکن سمرقند کے مقابلے میں بخارا زیادہ مشہور ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شہر پر کئی اقوام کی حکومتیں رہی ہیں اور اسلامی مملکت کے طور پر بھی بخارا دنیا میں سرفہرست ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بخارا شاہراہ ریشم (Silk Route) پر واقع ہے یہاں صدیوں سے تجارت کے لیے بہت سے ملکوں سے لوگ آتے تھے اس لیے تاجروں کی آمد ورفت سے ایک مشترکہ تہذیب کی بنیاد پڑتی ہے۔آج بھی بخارا شہر میں قدیم سرائے اور بازار موجود ہیں جو صدیوں کی تہذیبی گہما گہمی کی یاد دلاتی ہیں، ان تمام سرایوں کو آج بھی اسی طرح محفوظ رکھا گیا البتہ ان میں جدید دور کی دکانیں ہیں جن میں زیادہ تر قومی صنعت و حرفت کی نمائش گاہ ہیں۔مرکزی ایشیا میں اس شہر کو جائے وقوع کے لحاظ سے کافی اہمیت حاصل ہے۔یہاں اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے کافی کام ہوئے ہیں۔آج بھی یہاں کی مساجد اور مقبرے قدیم زمانے کی یاد دلاتے ہیں اور دنیا بھر سے سیاح اس شہر کو دیکھنے آتے ہیں۔بعض سیاحوں نے سمرقند اور بخارا کو 'مزارات' کا شہر کہا ہے، ان کا یہ خیال بھی اس لیے درست ہے کہ اس سرزمین میں عالمی شہرت یافتہ بزرگان دین اور صحابہ کرام کے مزارات موجود ہیں اسی لیے اس سرزمین کو روحانی سرزمین بھی کہا جاتا ہے۔

تاریخ اسلام میں بخارا پہلی مرتبہ 850ء میں دولت سامانیہ کا دارالحکومت قرار پایا۔ سامانیوں کے دور عروج میں یہ شہر اسلامی دنیا میں علم وادب کے مرکز کے طور پر جانا جاتا تھا۔ ایک زمانے میں بخارا ایرانی تہذیب کا اہم ترین مرکز تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے تین سو سال پُرانا ہے۔ یہ شہر کو 5 اور 7 صدی عیسوی میں فن تعمیر کے حوالے سے تمام مملکتوں میں ممتاز تھا۔ اس شہر کو حضرت امام بخاری کی وجہ سے بھی جانا جاتا ہے اور عزت اور احترام سے اس شہر کا نام لیا جاتا ہے کیونکہ قرآن کریم کے بعد پوری دنیا میں جو کتاب سب سے اہم مانی جاتی ہے وہ امام بخاری کی ''صحیح البخاری'' ہے۔ امام بخاری نے بڑی محنت و مشقت سے رسول اللہ کی حدیثوں کو جمع کیا۔ ان کی اس کتاب کو پوری دنیا میں سب سے زیادہ مستند مانا جاتا ہے۔ اسی لیے ازبکستان کے شہر بخارا کو پوری دنیا میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس ملک کو حضرت امام ترمذی علیہ الرحمۃ والرضوان کی وجہ سے بھی شہرت اور عظمت حاصل ہے۔ امام بخاری کے بعد امام ترمذی جن کا تعلق شہر ترمذ سے ہے جو بلخ سے کچھ فاصلے پر دریائے آمو کے کنارے واقع ہے۔ امام ترمذی کی شخصیت عالم اسلام میں عقیدت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ آپ نے امام بخاری امام ابوداؤد سے درس حدیث لینے کے بعد اسی طریق کو اپنایا۔ حدیث کو جمع کرنے کئے لیے آپ نے بھی خراسان، عراق اور حجاز کا سفر کیا ''جامع ترمذی'' کو بھی عالم اسلام میں استناد کا درجہ حاصل ہے۔ اسی لیے اس کی لاتعداد تشریحات لکھی گئیں۔ پورے عالم اسلام میں اور بالخصوص برصغیر کے تمام مدارس میں صحیح البخاری اور جامع ترمذی پڑھائی جاتی ہیں۔ ان دونوں کتب کی وجہ سے بھی اس ملک کو جو عزو شرف حاصل ہے وہ یقیناً احادیث کی نسبت کی وجہ سے ہے۔ آج ازبکستان میں ترمذ ایک مشہور شہر ہے بڑی تعداد میں لوگ اس شہر کی زیارت کی غرض سے آتے ہیں کیونکہ اس شہر کی نسبت امام ترمذی سے ہے۔ ویسے تدوین حدیث کی خدمت کے طور پر اس ملک کی خدمات کی نظیر نہیں ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی اس ملک سے ایسی بڑی ہستیوں کا نام جڑا ہوا ہے کہ ان کے اسمائے گرامی ہی اس ملک کی عظمت کے لیے کافی ہیں۔ جیسے حضرت امام ابو حنیفہ رضہ اللہ تعالیٰ عنہ کی جائے پیدائش یہی سرزمین ہے۔ صاحب ہدایہ کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے۔ ابوریحان محمد بن احمد البیرونی جیسے عظیم شخص کا بھی تعلق اسی ملک سے ہے۔ البیرونی جیسا سائنسداں، ماہر فلکیات، ماہر طب، ماہر علم نجوم اور کئی علوم پر دسترس رکھنی والی اس شخصیت کا تعلق ازبکستان کے شہر خوارزم صوبے سے ہے۔ ان کے علاوہ کئی علماء و مشائخ کی یہ سرزمین ہے۔ بالخصوص بخارا کو یہ اعزاز حاصل ہے۔ اس شہر کو سات خواجگان کا شہر بھی کہا جاتا ہے (اس کی تفصیلات آئندہ باب میں ملاحظہ فرمائیں) اسی طرح مرزا الغ بیگ جس نے علوم وفنون کو مرکزی ایشیا میں عام کیا۔ ان تمام ماضی کی شخصیات اور علم کے تسلسل کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ نے اس ملک پر خاص رحمت کی ہے۔

بطور مہمان پروفیسر تاشقند میں میری آمد: یہاں کا تعلیمی نظام اور علمی ماحول

تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کی دعوت پر تاشقند جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ میرے لیے اعزاز کی بات تھی کہ اس ادارے نے مہمان پروفیسر کے طور پر لیکچرز دینے کے لیے مدعو کیا۔ میں شکر گزار ہوں ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا کا کہ انھوں نے میرے نام کی تجویز اپنی یونیورسٹی میں پیش کی اور جنوب ایشیائی زبانوں کے شعبے کی صدر پروفیسر الفت محب نے تمام کاروائی مکمل کی اور عزت مآب ریکٹر (جو بنیادی طور پر وائس چانسلر ہیں، یہاں انھیں ریکٹر کہا جاتا ہے، نے منظوری دی۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں بی۔اے سے پی ایچ ڈی تک کی تعلیم کا نظم ہے۔ تاشقند جانے سے قبل اس شعبے کے بیشتر اساتذہ سے دہلی میں ملاقات تھی اور جن اساتذہ سے ملاقات نہیں تھی ان کے بارے میں دہلی میں تعلیم حاصل کر رہے تاشقند کے طالب علموں نے بتایا تھا۔ جے این یو کے طالب علم عزیزی مظفر زادہ نے سفر اور دیگر متعلقات کے حوالے سے وہ مستقل میرے رابطے میں رہے ویزا اور سفر کی دیگر تمام مرحلوں میں عزیزی مظفر فکر مند رہے کہ میرا قیام تاشقند بہتر ہو، وہ خود وہاں موجود نہیں تھے مگر ہر دن کی خبر لیتے اور ان کے کئی دوست احباب تاشقند میں ان کی جگہ میری ضیافت میں مصروف رہے۔ اسی طرح کمولہ ستیہ بولا جو پہلے جے این یو کی طالبہ تھیں اب جامعہ میں ہیں انھوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور اور خود تاشقند میں نہ ہونے کا افسوس کیا، ان طالب علموں کو اللہ دین و دنیا میں سرخروئی عطا کرے۔ اس کے علاوہ انڈین کلچر سینٹر کے سابق ڈائریکٹر پروفیسر قمر رئیس (مرحوم) کی سرگرمیوں کے سبب تاشقند سے واقفیت تھی اور لال بہادر شاستری سینٹر فار انڈین کلچر کے موجودہ ڈائریکٹر پروفیسر چندر شیکھر صاحب کی علمی و ادبی کاوشوں کے سبب تاشقند میں اردو۔ ہندی تعلیم اور دیگر سرگرمیوں سے آشنائی ہوئی تھی اس لیے تاشقند جاتے ہوئے مجھے بالکل بھی اجنبیت کا احساس نہیں تھا کہ میں کسی غیر ملک میں جا رہا ہوں۔ 24 اپریل کی رات جب تاشقند ائیر پورٹ پر اترا تو تاریخ بدل چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر محیا اور پروفیسر الفت ائیر پورٹ کے باہر میرے لیے منتظر ہیں۔ میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ رات آدھی گزر گئی ہے اور یہ دو محترم خواتین میرے لیے زحمت کر رہی ہیں۔ ائیر پورٹ سے باہر نکلتے ہی سرد ہواؤں کی

جھونکوں نے میرا استقبال کیا اور اور تاشقند کی مٹی کی سوندھی خوشبو نے مشام جاں کو معطر کر دیا۔ کچھ ہی دیر قبل بارش رکی تھی اس لیے موسم کافی خوشگوار تھا، خنکی بڑھ چکی تھی لیکن ڈاکٹر محیا اور پروفیسر الفت نے جس گرمجوشی سے میرا استقبال کیا اس نے اس موسم کی سرد ہواؤں کو مات دے دی۔ ان کے ہمراہ انسٹی ٹیوٹ کے مہمان خانے پہنچا، انھوں نے وہاں ضرورت کی تمام چیزوں کا پہلے سے انتظام کر رکھا تھا اس لیے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ رات کے دو بج چکے تھے اس لیے انھیں رخصت کرتے ہی بستر پر دراز ہو گیا دہلی کی گرمی سے آکر لحاف میں سونے کا لطف ہی کچھ اور تھا اس لیے بہت اچھی نیند آئی۔ لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ اگر یہ اساتذہ چاہتے تو کسی طالب علم کو مجھے لینے کے لیے بھیج سکتے تھے مگر خود دونوں معزز خواتین اساتذہ نے ائیر پورٹ آکر یہ تاثر دیا کہ ازبکستان کے لوگ مہمان نواز ہیں۔ دوسرے دن صبح ڈاکٹر محیا صاحبہ کے گھر ناشتہ کی دعوت تھی، پر تکلف ازبکی ناشتے کا لطف لیا اور کچھ ضروری کام کے بعد ان کے ہمراہ انسٹی ٹیوٹ پہنچا، بہت ہی والہانہ انداز میں شعبے کے اساتذہ نے مصافحہ کیا اور پر خلوص استقبال کیا۔ چونکہ اس دن مجھے کلاس نہیں لینی تھی اس

لیے نصاب تعلیم پر گفتگو کی اور اپنی کلاسوں کے حوالے سے معلومات حاصل کیں۔ تقریباً دو گھنٹے صدر شعبہ کے ساتھ اسٹاف روم میں موجود رہا، یہی صدر کا کمرہ ہے اور یہی اسٹاف روم بھی ہے۔ پروفیسر الفت صاحبہ مستقل دفتری کاموں میں مصروف رہیں لیکن جس لمحے انھیں فرصت ملتی میری خیریت دریافت کر لیتیں اور یہ کہتیں کہ مطمئن رہیں آپ کو یہاں کسی طرح کی تکلیف نہیں ہو گی۔ ان کے ملنے جلنے کے انداز سے مجھے محسوس ہو چکا تھا کہ یہاں کا ماحول بڑا خوشگوار ہے۔ ڈاکٹر محیا کو میری زیادہ فکر تھی کیونکہ انھیں کی تجویز سے میں تاشقند پہنچا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر لولا مکتوبہ سے ملاقات ہوئی، مجھے لگا ہی نہیں کہ ان سے پہلی مرتبہ ملاقات ہو رہی ہے۔ انھوں نے ہر ممکن تعاون پیش کیا اور اس کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ اس دوران کمرے میں طالب علموں کے آنے جانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ انھیں میرے آنے کی اطلاع تھی لہذا ہر آنے والے طلب علم نے مجھے قیاس سے پہچانا کہ یہی ہندستانی استاد ہیں، سب نے بڑے احترام اور

تشویق سے سلام کیا۔کمرے میں داخل ہونے والے طلبہ وطالبات سے اساتذہ جس خلوص اور اپنائیت سے باتیں کررہے تھے یہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور دل میں سوچا کہ کسی بھی تعلیمی ادارے میں اساتذہ اور طالب علموں کے درمیان ایسا سلوک یقیناً تعلیمی ماحول میں ایک خوشگوار اضافہ ہوتا ہے۔

جس دن میری پہلی کلاس تھی ڈاکٹر محیا میرے ساتھ کلاس روم میں موجود تھیں انھوں نے میرا تعارف ازبکی زبان میں کرایا۔زبان سمجھنا تو مشکل تھا مگر طلبہ وطالبات کے چہرے بشرے سے خوشی کے تاثرات نمایاں تھے ۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں ایک کلاس 80 منٹ کو ہوتا ہے اور مجھے مسلسل دو کلاسیں لینی تھیں۔میں نے ان کا عندیہ معلوم کیا کہ وہ کیا پڑھنا چاہتے ہیں، ڈاکٹر محیا اور تمام طلبہ وطالبات نے اردو گرامر پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔میں نے بھی اس انسٹی ٹیوٹ کے نصاب کے مطابق پاؤر پوائنٹ کے ذریعے اسباق تیار کر رکھے تھے۔کلاس شروع ہوئی تو طالب علموں نے جس اشتیاق سے درس میں حصہ لیا وہ میرے لیے باعث مسرت اور باعث حیرت بھی تھا کیونکہ یہ پہلی جماعت کی کلاس تھی یعنی بی۔اے سال اول جس میں اردو ہندی دونوں زبانوں کے طالب علم ایک ساتھ موجود تھے۔مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ اردو سمجھ پائیں گے لیکن وہ جس طرح میری باتوں کو سمجھ رہے تھے اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اساتذہ نے ان پر خوب محنت کی ہے ورنہ چھ سات مہینوں میں کسی دوسری زبان پر ایسی مہارت ممکن نہیں۔اس کے علاوہ یہاں کے نصاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ تمام اردو والوں کو ہندی ایک سبجیکٹ کے طور پر اور ہندی والوں کو اردو ایک سبجیکٹ کے طور پر لازمی

پڑھنا ہوتا ہے۔ اسّی منٹ کا وقت کب ختم ہوا معلوم نہیں ہوا۔ کچھ وقفے کے بعد یہی کلاس دوبارہ شروع ہوئی۔ اتنی دیر میں تمام طالب علم مجھ سے مانوس ہو چکے تھے جو تھوڑی بہت اجنبیت کا احساس تھا وہ بالکل ختم ہو چکا تھا۔

ہر روز گیارہ بجے آدھے گھنٹے کا وقفہ ہوتا یہ وقفہ یادگار رہا کیونکہ اس وقت صدر کے کمرے میں تمام اساتذہ ایک ساتھ بیٹھ کر چائے ناشتہ کرتے، ہر استاد اپنے گھر سے کچھ لے کر آتے اور ساتھ مل کر چائے اور ناشتے کے ساتھ خوش گپی کرتے۔ تمام اساتذہ نے میرا خاص خیال رکھا اور ہر روز نئے ازبکی کھانے کا لطف ملا۔ محترمہ خمارہ صاحبہ بڑے خلوص سے چائے تیار کرتیں اور سب کو پیش کرتیں۔ یہ ماحول دیکھ کر میں بے انتہا خوش تھا۔

دو تین اہم باتیں جس کو میں نے ستائش کی نظروں سے دیکھا وہ یہ کہ کلاسیں صبح کے ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوتی تھیں اس لیے اساتذہ اور طالب علم سب وقت سے پہلے کلاس میں موجود ہوتے۔ مین گیٹ پر ہر روز کچھ آفیسران موجود ہوتے جو یہ دیکھتے کہ طلبہ و طالبات صحیح لباس میں آرہے ہیں یا نہیں۔ کلاس شروع ہوتے ہی ہر کلاس روم میں یہ آفیسران رجسٹر لے کر پہنچتے، مجھے معلوم نہیں ہوا کہ

کونسار جسٹر ہے لیکن اتنا اندازہ ہوا کہ ٹائم ٹیبل میں جو کلاس درج ہے وہ ہو ری ہے یا نہیں؟ استاد موجود ہیں یا نہیں اور طالب علموں کی اتنی تعداد موجود ہے یا نہیں؟ یہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ تعلیم کے معاملے میں انسٹی ٹیوٹ کا نظام سخت ہے۔ ایک طالب علم نے مجھے بتایا کہ اگر ورکنگ ڈے میں ہم طالب علم شہر یا شہر کے باہر جانا چاہیں تو ممکن نہیں کیونکہ پولیس دریافت کر لیتی ہے کہ پڑھائی چھوڑ کر کہاں سیر و تفریح ہو رہی ہے۔ یہ بات بہت اچھی لگی اور اندازہ ہوا کہ اس ملک میں تعلیم کا گراف کیوں اتنا اوپر ہے۔ تینوں جماعت کی کلاسوں میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ پائی اور لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیاں تعلیم میں زیادہ سنجیدہ نظر آئیں۔ میں اپنے علمی اسفار میں اس سفر کو بھی بہ نظر تحسین دیکھتا ہوں کہ تاشقند

جیسے عالمی شہرت یافتہ شہر میں اردو کی شمع روشن کرنے والے موجود ہیں، ان سب سے ملاقات میرے لیے ایک نعمت سے کم نہیں البتہ انسٹی ٹیوٹ کے ریکٹر صاحب سے ان کی مصروفیات کے سبب ملاقات نہیں ہو سکی جس کا قلق ہے لیکن اس کمی کو نائب ریکٹر جناب نادر عبداللہ صاحب نے پوری کی، ان سے خوشگوار ملاقات رہی۔

اس انسٹی ٹیوٹ نے اردو ہندی ممالک یعنی ہندستان پاکستان سے اپنا رشتہ ہموار رکھا ہے ہر سال طلبہ و طالبات زیادہ تر ہندستانی اور کچھ پاکستانی وظیفے پر ان ممالک میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جاتے ہیں۔ حکومت ہند کی جانب سے اس انسٹی ٹیوٹ میں مہاتما گاندھی کے نام سے ایک ہال تیار کیا ہے جسے ''ہندستانی سینٹر کہا جاتا ہے اور پاکستان نے بھی ایک ہال بنوایا ہے جو اس سے قدرے چھوٹا ہے اسے '' پاکستانی کورنر'' کہا جاتا ہے۔ لال بہادر

شاستری سینٹر فار انڈین کلچر، تاشقند کی جانب سے بھی ان کی مستقل حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ مگر اس رشتے کو اور آمد و رفت کے سلسلے کو مزید فروغ دینے کی ضرورت ہے تاکہ اساتذہ اور طلبہ وطالبات کو اہل زبان کے ساتھ رہنے اور ان کی تہذب کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ مرکزی ایشیا میں چونکہ ازبکستان ایک ابھرتی ہوئی طاقت ہے اس لیے اس ملک کو ہندستان جیسے عظیم ملک کے ساتھ مزید تعلیمی معاہدے کرنے کی ضرورت ہے تاکہ زبان اور اقتصاد کی سمت میں مزید ترقی کے امکانات روشن ہو سکیں۔

تاشقند مشرق وسطیٰ میں اردو۔ہندی کا عظیم مرکز

مشرق وسطیٰ میں اردو اور ہندی کے لیے تاشقند ایک اہم مرکز ہے۔ تاشقند کو کئی اعتبار سے اہمیت اور شہرت حاصل ہے لیکن برصغیر کے لیے اس شہر کی ایک بڑی شناخت اردو اور ہندی بھی ہے کیونکہ تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے تحت 1947 سے اس ادارے میں اردو۔ہندی کی تعلیم دی جارہی ہے اور یہ سلسلہ اب بھی برقرار ہے۔ تاشقند میں کئی جدید اور روایتی تعلیمی ادارے موجود ہیں لیکن تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کو ایک خاص اہمیت اس لیے بھی حاصل ہے کہ اس ادارے میں دنیا کی اہم مشرقی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کسی بھی غیر ملک میں دوسرے ملک کی زبان کی تعلیم اور درس وتدریس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ براہ راست اس ملک کی تہذیب اور اس کے تمدن سے آگہی حاصل کرنا۔ اردو ہندستان کی قدیم زبان ہے جو ایک عرصے تک سرکاری زبان بھی رہی ہے اس کے بولنے والوں کو تعداد برصغیر میں تقریباً تیس کروڑ سے زیادہ ہے۔ اردو۔ہندی زبان اور ہندستان پر ازبکستان اور مشرق وسطیٰ کے تہذیبی اور تمدنی اثرات زندگی کے کئی شعبوں میں آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اردو زبان میں کثرت سے مشرق وسطیٰ کی زبانوں اور علاقائی بولیوں کے الفاظ آج بھی موجود ہیں۔ جہاں تک ازبکستان اور ہندستان کے باہمی رشتوں کی بات ہے تو مقام شکر ہے کہ زمانۂ قدیم میں بھی شاہراہ ریشم کے ذریعے اقتصادی تعلقات رہے تھے لیکن اس سے زیادہ علمی، مذہبی اور معاشرتی سطح پر گہرے رشتے موجود تھے۔ آج بھی ہندستان کے بہت سے رسوم ورواج میں مشرق وسطیٰ کی معاشرتی زندگی کے عناصر موجود ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ بابر نے ہندستان پر حکومت کی اس لیے یہ اثرات موجود ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بابر نے ہندستان پر غیر ملکی بن کر حکومت

نہیں کی بلکہ ہندستان کو اپنا ملک بنایا اور اپنے کو ہندستانی بنانے میں بابر نے اپنے لیے فخر سمجھا اسی لیے اس عہد میں معاشرتی سطح پر جتنی ترقیات ہوئیں ان میں مشترک قدریں اس زمانے میں بھی موجود تھیں اور آج بھی سماجی سطح پر لین دین کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں جسے ہم 'ہند۔وسط ایشیائی قدر' کہہ سکتے ہیں۔ان کی آمد کے بعد ہندستان میں بہت تیزی سے تبدیلیاں واقع ہوئیں ان میں ایک اہم واقعہ اردو زبان کا نکھر کر سامنے آنا ہے۔اسی لیے اردو اور ہندی زبانوں میں ایسے محاورے، الفاظ، ضرب الامثال موجود ہیں جو ان ممالک کی مشترکہ اقدار کی شاندار وراثت کی امین ہیں۔

اردو اور ہندی زبان کی تدریس اور تعلیم کے لیے سب سے پہلے یہ ادارہ قیام میں آیا لیکن پہلے اس ادارے کا نام ''ترکستان انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز'' تھا جہاں اردو۔ہندی کے علاوہ کئی اور مشرقی زبانیں پڑھائی جانی شروع ہوئیں 1911 میں اس ادارے کا نام تبدیل ہو کر ''تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز'' رکھا گیا۔اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ تہذیبی، لسانی اور

اقتصادی اعتبار سے جن ممالک سے نزدیک رہا ہے اس کی تہذیب و تمدن کو زبان کے ذریعے سیکھا اور سکھایا جائے۔ چنانچہ اس ادارے نے محنت و مشقت سے ایشیائی ممالک میں اپنی ایک شناخت قائم کی اور بہت تیزی سے یہ ادارہ ایشیا اور یوروپ کے ممالک میں پہچانا جانے لگا

لیکن مزید ترقی کے لیے اس ادارے کو دنیا کے دیگر اداروں سے کچھ سیکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ مجموعی طور پر اردو۔ہندی زبان کی تعلیم و تدریس کی وجہ سے ہمارے لیے یہ ادارہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔

اس ادارے سے اردو اور ہندی کی کئی نامی گرامی شخصیات وابستہ رہی ہیں۔ ابھی پروفیسر الفت محب صاحبہ اس شعبے کی صدر ہیں۔ان کے علاوہ بڑی تعداد میں ان کی رفیق کار موجود ہیں۔ جن میں ڈاکٹر سراج الدین نور متوف،ڈاکٹر محیا عبد الرحمانوا، ڈاکٹر لولا مکتوبہ، موجودوہ صدیقوا، سلیمانوا معمورا، شارا حمید وا مخلصہ، کمالہ ارگاشوا اور محترمہ تمارا خوجائیوا صاحبہ بہت ہی اخلاص اور محنت و مشقت سے درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ان اساتذہ میں بہت سے ایسے ہیں جن کے مضامین ملک اور بیرون ملک کے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ زیادہ تر اساتذہ پی ایچ ڈی کے علاوہ ڈی لٹ کی بھی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ ازبکستان میں تدریس کا ایک ایسا انوکھا نظام بھی ہے جسے دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی ہوئی۔ یہاں اساتذہ سبکدوش نہیں ہوتے۔ سبکدوشی کے بعد بھی یہ جب تک چاہیں تدریس سے وابستہ رہ سکتے ہیں۔ فی الوقت محترمہ تمارا صاحبہ ہیں جو تقریباً اسی سال کی نفیس خاتون ہیں وہ اب بھی بڑی سنجیدگی سے درس وتدریس سے وابستہ ہیں، عمر کے اس حصے میں بھی جس طرح ان کو چاق وچوبند دیکھا وہ قابل رشک ہے۔اسی طرح محترمہ موجودہ صادقوا بھی سبکدوشی کے بعد بھی وقت کی پابندی کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ آتی ہیں اور کلاسیں لیتی ہیں۔ دوسری قابل ستائش بات یہ ہے کہ تمام اساتذہ بڑے خلوص اور دوستانہ ماحول میں ایک ساتھ رہتے ہیں، کسی کے چہرے پر کسی کے لیے کوئی شکن نہیں دیکھا، سب ایک دوست کی طرح

ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور ساتھ مل کر انسٹی ٹیوٹ کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ طلبہ وطالبات کی بھی بڑی تعداد ہے۔ یہ تمام اساتذہ

طالب علموں کے ساتھ شفقت و محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اپنے بچوں اور دوستوں جیسا بے تکلفانہ سلوک کو دیکھ کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ دعا کرتا ہوں کہ یہ علمی درسگاہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے اور ہند۔ازبکستان دوستی مزید مضبوط ہو۔

کہا جاتا ہے کہ کسی اجنبی ملک میں جس کی زبان نہ آتی تو وہاں پہنچنے والا اندھا اور بہرہ ہوتا ہے کیونکہ زبان سمجھ نہیں سکتا اور راستے

معلوم نہیں ایسے میں اگر کوئی ساتھ نہ ہو تو تاشقند جیسا جنت نشان شہر بھی کسی غیر ملکی کے لیے دلفریبیاں تو پیدا کر سکتا ہے لیکن اس کے حسن و جمال کو دیکھنا اور محسوس کرنا محال ہوتا ہے۔ خدا بھلا کرے ڈاکٹر محیا، پروفیسر الفت اور ڈاکٹر لولا مکتوبہ کا کہ انھوں نے اس بات کو محسوس کیا اور کچھ طالب علموں کو میرے ساتھ رہنے کی ہدایت کی۔ان میں شاہجہاں سعد اللہ زادہ اور سمندر سلامو کا نام سر فہرست ہے۔ سمندر نام کے ایک اور صاحب ملے جو مہمان خانے کے نگراں تھے۔ یہ نام شاید قارئین کے لیے عجیب ہو لیکن اس نام کا مطلب پانیوں کا سمندر نہیں ہے بلکہ اس کا معنی آگ کا ایسا کیڑا ہے جو آگ میں رہتا ہے اور جلتا نہیں اسی لیے اکثر لوگوں کو اردو کا یہ شعر سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے:

یار کے پنجۂ حنائی میں　　نامہ کیا پَر جلے سمندر کا

بہر کیف یہ دونوں طالب علم میرے لیے اس سفر میں میری آنکھ اور کان بنے۔ پہلے دن ملاقاتوں کے سلسلے کے بعد مہمان خانے جانے سے بہتر میں نے تاشقند کے تاریخی مقامات کی سیر کو ترجیح دی۔ ہم ''خست امام'' اسے ہست امام بھی کہتے ہیں جو شاید حضرت امام سے بگڑ کر خست امام کے نام سے مشہور ہو گیا ہے، کی زیارت کے لیے نکل پڑے۔ موسم خوشگوار تھا، بادل چھائے ہوئے تھے، ہلکی خنکی تھی، ہوائیں تیز چل رہی تھیں اس سہانے موسم میں تاشقند کی سڑکیں اور گلیاں اپنی جانب متوجہ کر رہی تھیں۔۔۔۔۔۔۔ میٹرو اسٹیشن سے نکل کر جوں ہی بازار کی جانب روانہ ہوئے تیز بارش نے ہمارا استقبال کیا۔ غنیمت تھا کہ ہم مارکیٹ میں تھے فوراً ہی ایک چھتری

خریدی، چھتری کی قیمت ستر ہزار دینے پڑے، مجھے ذرا تکلف ہوئی کہ ستر ہزار میں ایک چھتری؟ (یہ ستر ہزار تقریباً ساڑھے پانچ سو انڈین روپے تھے) معاملہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں سو دو سو میں بہت سی چیزیں خریدی جاسکتی ہیں لیکن یہاں کی کرنسی کی قیمت چونکہ بہت کم ہے اس لیے کوئی بھی چیز لیں دس بیس ہزار سے شروع ہوتی ہے۔ لہذا ہم جیسوں سے جب دس بیس ہزار کسی معمولی چیز کے لیے طلب کیا جاتا ہے تو عجیب لگتا تھا اسی لیے پندرہ دنوں میں بھی یہاں کی کرنسی سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا۔ بہر کیف ہلکی ہلکی پھوار اور ٹھنڈی ہواؤں نے

موسم کو اور بھی سہانا کر دیا تھا، شاہجہاں کے ساتھ گرم گرم ازبکی کباب اور چائے کے بعد جب بارش رکی تو ہم ''خست امام'' کی جانب

روانہ ہوئے کچھ ہی دیر میں اس کمپلکس کے سامنے موجود تھے، شام کی ہلکی سرمئی رشنی میں یہ وسیع و عریض کمپلکس بہت ہی خوبصورت لگ رہا تھا۔ لب سڑک واقع اس کمپلکس کے سامنے والے حصے میں ایک مسجد تھی جو اپنے طرز تعمیر کے سبب دیدہ و دل کو ذوق نظارہ سے مسرور کر رہی تھی۔ وضو کے بعد مسجد میں داخل ہوئے تیموری طرز تعمیر کی شاندار عمارت، گنبد و محراب کے نقش و نگار، بڑے ستون اور لکڑی کے بڑے دروازے اور لکڑی کے قومی نقش و نگار سیاحوں کا حیرت زدہ کر رہے تھے۔ اس کے وسط میں ایک اور گنبد والی مسجد نما

عمارت ہے جو بنیادی طور پر قرآن میوزیم ہے اس میوزیم میں تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دست مبارک سے لکھا قرآن پاک موجود ہے جو تین سو ترپن (353) چمڑے کے اوراق پر مشتمل ہے، اسی قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے آپ شہد ہوئے تھے، اس قرآن پاک پر آپ کے خون مبارک کے نشانات موجود ہیں۔ اس قرآن پاک کے بارے میں تصدیق سے کہا گیا ہے کہ یہ وہی قرآن کریم ہے جس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون مبارک کے نشانات موجود ہیں۔ جس وقت آپ کی شہادت ہوئی آپ اسی قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے قرآن پاک کی حفاظت اور کسی بھی طرح کی تحریف سے پاک رکھنے کے لیے چھ نسخے تیار ہوئے جس میں سے پانچ نسخوں کا کوئی علم نہیں کہ کہاں ہیں۔ صرف یہ نسخہ جو تاشقند میں موجود ہے وہی اب تک دریافت ہوا ہے۔ یہ نسخہ امیر تیمور کے زمانے میں عراق سے لایا گیا تھا۔

تاشقند کی بارش میں نور سے نہلائی ہوئی اس مسجد کا نظارہ روح پرور تھا، مسجد سے نکل کر درمیان میں واقع قرآن میوزیم پہنچے یہاں دنیا کے نادر و نایاب قرآن کریم کے نسخے موجود ہیں اور اب تک قرآن کریم کے جتنی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں ممکنہ طور پر یہاں موجود ہیں اس کے علاوہ قرآن و حدیث کے کئی اہم مخطوطات بھی ہیں۔

ہم دیر تک اس کی زیارت کرتے رہے لیکن جب باہر جانے کی سوچا تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اس لیے اسی میوزیم میں بیٹھے

رہے بارش کی وجہ سے لوگوں کو بھیڑ کم تھی لہذا زیارت کا اچھا موقع مل گیا۔

باہر آخری سرے پر مسجد نما عمارت تھی جواب آرٹ گیلری میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس گیلری میں بالخصوص تاشقند اور بالعموم ازبکستان کی قومی دستکاری کی چیزیں برائے فروخت تھیں جن میں سب سے دیدہ زیب لکڑی سے بنی ہوئی ریحل اور دیگر اشیا کے علاوہ قدیم اور قومی طرز کے زیورات سیاحوں کو اپنی جانب متلفت کر رہے تھے۔ بارش یونہی جاری تھی کبھی ہلکی اور کبھی تیز، مغرب کے بعد ہم یہاں سے روانہ ہوئے شاہجہاں نے مجھے گیسٹ ہاؤس پہنچایا اور وہ خود اپنے فلیٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔

جمعہ کو کچھ دیر کے لیے ہم انسٹی ٹیوٹ گئے اساتذہ سے ملاقاتیں کیں، تاشقند اور ہندستان کے روابط، اردو اور ہندی زبان کے فروغ کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی۔ ابھی ہم طے ہی کر رہے تھے کہ کس جانب جانا چاہیے کہ اتنے میں پروفیسر چندر شیکھر صاحب کا فون آیا انھوں نے فون پر ہی تاشقند میں میرا استقبال کیا اور لنچ کی دعوت دی لیکن ہم اساتذہ کے ساتھ لنچ کر چکے تھے تاہم بلا تاخیر شاہجہاں سعد اللہ زادہ کے ساتھ لال بہادر شاستری سینٹر فار انڈین کلچر، تاشقند میں کلچرل کاؤنسلر پروفیسر چندر شیکھر صاحب سے ملنے پہنچ گئے۔

بڑے تپاک سے انھوں نے خیر مقدم کیا دیر تک تاشقند اور تاشقند میں اردو، ہندی اور فارسی کے علاوہ یہاں کے علمی و ادبی ماحول اور شخصیات کے متعلق باتیں کیں۔ کیونکہ اگلی صبح انھیں دہلی کے لیے نکلنا تھا انہیں بہت سی تیاریاں کرنی تھیں اس لیے ان سے اجازت لے کر ہم شاہجہاں کے ساتھ خیابان تیمور اور تیمور میوزیم دیکھنے نکلے۔

خیابان تیمور ازبکستان ہوٹل کے عین مقابل واقع ہے۔ یہ یہاں کا قدیم ہوٹل ہے جو تاشقند کے اہم شاہراہ پر واقع ہے اسی کے سامنے بہت ہی خوبصورت پارک ہے جس کو خیابان تیمور کہتے ہیں۔ بہت سلیقے سے اس کا رکھ رکھاؤ کیا جاتا ہے، ویسے ازبکستان کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں کی ہر چیز میں ایک سلیقہ ہے اور جمالیاتی ذوق دیکھنے کو ملتا ہے خواہ وہ سڑکوں پر لگے بجلی کے کھمبے ہوں یا سڑکوں پر

بنے نشانات، چھوٹی سے چھوٹی چیزوں میں خوبصورتی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے سو اس پارک میں بھی یہ تمام چیزیں دیکھنے کو ملیں۔ سڑک کے دونوں کناروں پر خوبصورت ہرے بھرے چنار، پستہ اور مختلف انواع کے درختوں کے ساتھ ''کشتاں'' کے خوبصورت اور سایہ دار درخت شہر کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔

"کشتاں" ازبکستان کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے والا درخت ہے۔ ازبکستان میں یہ درخت کثرت سے پایا جاتا ہے۔ یہ بہت ہی گھنا، سایہ دار درخت ہے لیکن اس کی ایک اہم خوبی بھی ہے اس کے پھول سفید ہوتے ہیں اور پھل ڈارک براؤن (سرخی مائل) اس کا پھل تقریبا جامن کی طرح ہوتا ہے لیکن بہت سخت، اس کے پھل کو پیس کر سیرپ بنایا جاتا ہے جو ہڈیوں کے جوڑوں کے لیے بہت ہی مفید ہوتا ہے۔ یہ گھریلو نسخے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے کہتے ہیں جن کے گھٹنوں کے گودے کم ہونے لگتے ہیں ان کے لیے بہت مفید ہے۔ خیر ان خوبصورت سڑکوں سے گزرتے ہوئے خیابان تیمور میں داخل ہوئے۔ پارک کے وسط میں امیر تیمور کا ایک بڑا سے مجسمہ بنا ہوا جس میں امیر تیمور کو گھوڑے پر بیٹھا دیکھایا گیا ہے۔ یہاں ہر آنے والا سیاح ضرور اس کے سامنے یادگار کے طور پر تصویریں لیتا ہے۔

پارک سے گزرتے ہوئے ہم پیدل ہی تیمور میوزیم کی جانب چل پڑے۔ تاشقند کا تیمور میوزیم جس میں تیموری عہد کی نایاب و نادر اشیا کو جمع کر دیا گیا۔ عمارت کے نقش و نگار آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں۔ ازبکستان کے اہل اقتدار کی تہذیبی شناخت قائم رکھنے کی

کوششوں کا یہ زندہ ثبوت ہے اسی لیے اس میوزیم کو یہ وقار حاصل ہوا ہے کہ ازبکستان آنے والے سیاح ضرور اس میوزیم کو دیکھنے آتے ہیں۔

اس دن کا موسم ذرا گرم تھا اس لیے ہم تھک گئے اور سر شام ہی گیسٹ ہاؤس واپس آ گئے۔ کچھ دیر آرام کیا ہو گا کہ ڈاکٹر محیا کے ایک طالب علم پہنچے اور مجھے محیا صاحبہ کے گھر لے گئے جہاں انھوں نے پُر تکلف عشائیہ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ان کی بہن محترمہ۔۔۔۔۔۔ نے طرح طرح کے ازبیکی کھانے بنائے۔ محترمہ الفت صاحبہ بھی ساتھ تھیں۔ ابھی ہم کھانا سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بارش

شروع ہوگئی۔اسی بہانے دیر تک ہم باتیں کرتے رہے اور گرین ٹی کا لطف لیتے رہے۔ بارش تھمی تو الفت صاحبہ کے ساتھ کار میں سوار

ہوئے پہلے انھوں نے مجھے گیسٹ ہاؤس پہنچایا پھر اپنے گھر کو روانہ ہوئیں ۔ رات کو میرے محترم دوست اور انسٹی ٹیوٹ کے استاد ڈاکٹر سراج الدین نورمتوف صاحب کا فون آیا، بڑی محبتوں سے انھوں نے اپنی ضیافت کی پیشکش کی، ان سے نو بجے صبح ملاقات کا وقت طے ہوا۔ شاید ابھی نو بجنے میں کچھ منٹ باقی ہی تھے کہ سراپاانکسار کے ساتھ وہ کمرے میں تشریف لے آئے۔ان کی محبت اور خلوص کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ان سے میری پانچ سال قبل پہلی ملاقات ہوئی تھی جب وہ میری دعوت پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے عالمی سیمنار میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔تب سے راہ ورسم تھی اس لیے میری تاشقند آمد سے وہ بہت خوش تھے، وہ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ بتایا جائے مگر مصروفیات کے سبب ممکن نہ ہوسکا۔ خیر ان کے ساتھ تاشقند کے مشہور علاقے۔۔۔۔۔۔۔۔کی سیر کو گئے پہلے انھوں نے ایک ریسٹورینٹ میں ازبکستان کے مشہور کباب سے ضیافت کی اس کے بعد اسی علاقے سے متصل پارک میں گئے جو بین الاقوامی دوستی کا علاقہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس علاقے میں تقریباً تمام بین الاقوامی دفاتر موجود ہیں۔ تفریح کرتے ہوئے ان کے ساتھ بارہ بجے تک انسٹی ٹیوٹ آگئے اگلے دو دنوں تک کلاسیز نہیں تھیں اس لیے تاشقند میں ہی سیر و تفریح کا پروگرام بنایا۔ڈاکٹر محیاعبدالرحمانوا نے تاشقند کے قدیم بازار 'چار سو' جانے کو پلان مرتب کیا یہ قدیم شہر تاشقند میں واقع ہے۔چار سو دہلی کے چاندنی چوک جیسا پرانا بازار ہے یہاں دور تک پھیلے اس بازار میں ہر طرح کی چیزیں دستیاب ہیں خاص طور پر میوے اور گھریلو اشیا۔ شہر کے لوگ اکثر اسی جگہ شاپنگ کے لیے آتے ہیں۔ بازار کے ایک کونے میں سونے کے زیورات کی بہت سی دکانیں بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ازبکستان میں سونے کے کھان موجود ہیں اس لیے سونا یہاں قدرے سستا ہے لیکن یہاں کا سونا زیادہ سے زیادہ ۱۸ کیریٹ کا ہوتا ہے۔ بہر کیف ہم نے بھی کچھ خشک میوے خریدے اور شام تک گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ شام کو میرے طالب علم مظفر زادہ کے دوست کی جانب

سے کھانے کی دعوت پر جانا تھا۔ شام سہانی ہو چکی تھی بارش کے بعد ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ یہاں عموماً مغرب بعد ہی کھانا کھالیا جاتا ہے لہذا مظفر کے دوست میر فیاض مغرب سے پہلے ہی گیسٹ ہاؤس پہنچے کیونکہ کھانے کے لیے شہر کے جنوبی علاقے کے مشہور ریسٹوری 'زاہد کباب' جانا تھا، محیا صاحبہ پہلے سے ہماری منتظر تھیں۔ واقعی یہ بہت ہی مشہور ریسٹورنٹ تھا۔ لوگ اپنی پہلے سے بُک کرائی سیٹوں کے خالی ہونے کا انتظار کر رہے تھے، ہمیں بھی کچھ دیر میں ایک مناسب جگہ مل گئی۔ یہاں مچھلی کے پکوان بہت مشہور ہیں سو ہم نے بھی مچھلی اور قومی طرز کے کباب کھائے۔ اب رات ہو چکی تھی اور ٹھنڈک بھی بڑھ چکی تھی اس لیے جلدی گیسٹ ہاؤس پہنچ کر آرام کرنا طے پایا اور اگلے دن یعنی اتوار کو تاشقند کے مضافات میں ''زنگی اوتا'' بزرگ کے مقبرے کی زیارت کا پروگرام بنا۔

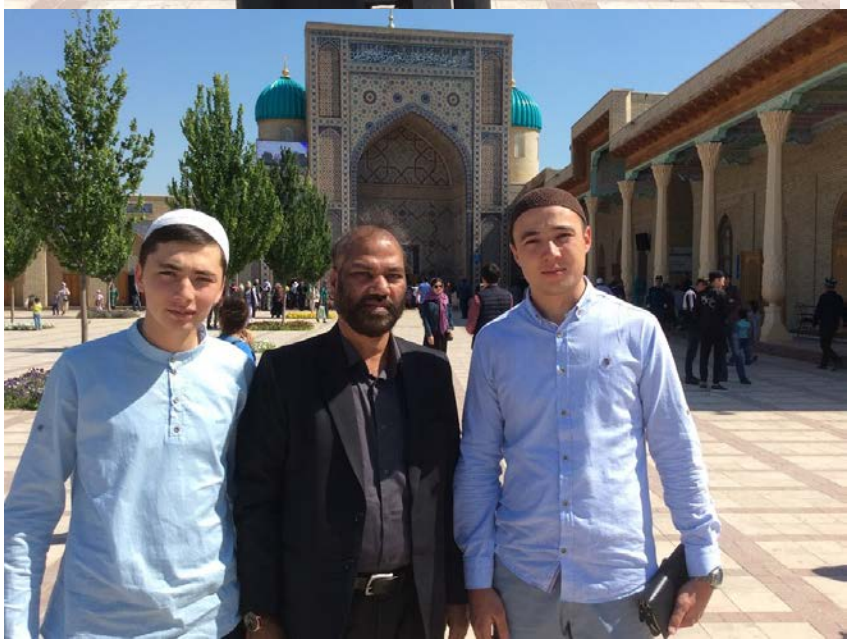

دوپہر تقریباً ایک بجے جناب میر فیاض کار لے کر گیسٹ ہاؤس پہنچے، شاہجہاں اور سمندر سلامو پہلے سے ہمارے ساتھ جانے کو تیار بیٹھے تھے۔ ازبکستان کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں اولیا اور صوفیا کے بہت سے مزارات ہیں انہی میں سے ایک زنگی اوتا کا دربار بھی ہے۔ یہ مقام تاشقند سے تقریباً پندرہ کیلو میٹر کی دوری پر واقع ہے اس پورے علاقے کو اسی نام سے جانا بھی جاتا ہے۔ شیخ علی خواجہ معروف بہ زنگی اوتا جس کو ہم اپنی زبان میں زنگی باب یا زنگی آقا کہہ سکتے ہیں کیونکہ ازبک میں اوتا یا آتا کا مطلب بابا یا آقا ہوتا ہے۔ یہ تیرھویں صدی کے بہت بڑے بزرگ ہیں ان کا رنگ بالکل سیاہ تھا اسی لیے ان کو زنگی کہا جاتا ہے، یہ اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں میں چرواہی کیا کرتے تھے ایک عام سے انسانوں کی زندگی بسر کرتے تھے لوگ ان کو ان کے حسن

اخلاق کی وجہ پہچاننے لگے اور بعد میں دین اسلام کی تبلیغ کے سبب لوگ ان کے معتقد بنتے گئے اور دیکھتے دیکھتے ایک بڑا حلقہ ان کی ارادت میں آگیا۔انھوں نے اسلام کی تبلیغ کی اور عوام کے درمیان اخوت و محبت کا پیغام عام کیا۔ان کا مرتبہ بہت بلند ہے ان کے کئی مریدین بھی ولایت کی منزلوں پر فائز ہوئے۔اور انھوں نے دین اسلام کے پیغامات کو وسط ایشیا میں عام کیا۔ان کے مقبرے کو بعد میں 1870 میں بنایا گیا۔یہ ایک بڑا احاطہ ہے جس میں مسجد، خانقاہ، طلبہ کے لیے اقامت گاہ، حوض، دروازہ خانہ، زنگی بابا اور انبر بی بی کا مقبرہ اور بلند مینار ہے، اسی سے متصل قدیمی قبرستان ہے۔اس قبرستان کی بعض قبروں پر ان کی تصاویر بھی لگی ہوئی ہیں۔اس دربار میں پورے وسط ایشیا سے بڑی تعداد میں زائرین آتے ہیں۔ان میں خواتین کی تعداد بہت زیادہ

ہوتی ہے۔اس پورے احاطے کی تعمیرات تیموری طرز تعمیر کا خوبصورت نمونہ ہے۔

ازبکستان میں کسی بزرگ کے آستانے پر میری یہ پہلی حاضری تھی، کئی چیزیں جو مجھے بہت اچھی لگیں وہ یہ تھیں کہ مزار جس گنبد کے نیچے واقع ہے اسی سے متصل دو کمرے بنے ہوئے ہیں جس میں فرش پر خوبصورت صاف ستھرے قالین بچھے ہوئے تھے اور دیوار سے متصل چاروں جانب بینچ لگے تھے۔مرد و عورت زائرین اس کمرے میں داخل ہوتے اور جس کو جہاں جگہ

ملتی بیٹھ جاتے اس کے بعد شاید حکومت کی جانب سے مقرر خادم درود شریف پڑھتے، قرآن پاک کی تلاوت کرتے اور اجتماعی طور پر فاتحہ میں سب شریک ہوتے، فاتحہ کے بعد نذر و نیاز کے لیے مخصوص ڈبے میں حسب اوقات روپے پیسے ڈالتے اور اکثر خواتین گھروں سے کھانے کی اشیا لے کر آتیں جو زائرین اور خدام کو پیش کی جاتی تھیں۔اس کے بعد سلام کر کے آہستگی اور ادب سے واپس آجاتے اس کے بعد باہر منتظر لوگ دوبارہ باری باری سے ان کمروں میں داخل ہوتے۔ فاتحہ خوانی کا یہ انداز بہت اچھا لگا۔ یہاں زیارت کرنے والوں میں زیادہ تر خواتین ہوتیں۔اس کے بعد جہاں بھی مزارات کی زیارت کے لیے گیا ہر جگہ یہی نظام پایا۔

شام کے چار بج چکے تھے، ہمیں بھوک لگ رہی تھی اس لیے میر فیاض ایک شاندار ریسٹورینٹ لے گئے اور لذیز کھانے کھائے۔

واپسی میں پہلے سے ارادہ تھا کہ تاشقند میں نئی طرز کی مسجد جو ''مینار مسجد'' کے نام سے مشہور ہے، کی زیارت کریں گے۔ تاشقند میں سیاحوں کے لیے یہ بڑی کشش کا مقام ہے ہمیں یہاں عصر کی نماز پڑھنی تھی۔ لیکن ٹریفک کے سبب جماعت تو نہیں مل سکی مگر ہمیں اس مسجد کی زیارت کا شرف ضرور حاصل ہوا۔

مینار جامع مسجد تاشقند میں طرز جدید کی عمارت کا شاندار نمونہ ہے۔ یہ سفید سنگ مرمر اور ٹائلس سے بنا ہے اس کا نیلا گنبد خوبصورتی میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ چاندنی رات میں اس کا نظارہ دلکش ہوتا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اتنی شفاف ہے کہ

عمارت کے رنگ کو نقصان نہیں پہنچاتا۔اندرونی حصے مشرقی طرز کے زیب وزینت سے مزین ہیں، محراب کے حصے میں خالص سونے سے قرآنی آیات اور نقش ونگار بنائے گئے ہیں۔ یہ مسجد 1913 میں بننی شروع ہوئی اور ۱۱ اکتوبر 1914 کو عید میلاد النبی کے موقعے سے اس کا افتتاح ہوا۔اس مسجد میں 2400 لوگ بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ یہاں عورتوں کے لیے بھی نماز کے لیے مخصوص جگہ ہے۔اس مسجد کے انتظام و انصرام کو دیکھ کر حیرت ہوتی کہ نمازیوں کی سہولت کے لیے تمام چیزیں مہیا ہیں۔وضوخانے میں ہر شخص کے لیے دو تولیے ایک سے منہ

ہاتھ پوچھنے کے لیے اور دوسرے تولیے سے پیروں کو پوچھنے کے لیے،ایک بار استعمال کے بعد دوبارہ استعمال نہیں ہوتا اسے دھونے کے لیے رکھ دیا جاتا ہے۔صفائی کا یہ حال ہے کہ ایک تنکا بھی نظر نہیں آئے گا، یہ مسجد مقامی اور غیر ملکیوں کے لیے قابل زیارت مقام بن گیا ہے۔اللہ اس کے انتظام وانصرام کرنے والوں کو جزائے خیر دے اور اس ملک کو اپنے حفظ وامان میں رکھے جس نے اسلامی آثار کو سنبھال کر رکھا ہے۔

میری یہ کوشش تھی کہ مختصر قیام کی مدت میں جس قدر ممکن ہو تاریخی مقامات کو دیکھ لو ں چنانچہ ہر روز دو بجے کے بعد شاہجہاں کے ساتھ شہر کی جانب نکل جاتا آج میدان استقلال کی سیر کو نکلا ۔ جسے وہاں

(Mustaqillik Maydoni) کہا جاتا ہے ۔ اسی سے منسلک علاقے میں صدر ازبکستان کا گھر اور دفتر ہے، سویت یونین کے زمانے میں یہاں لینن کا یک دیو قامت مجسمہ ہوا کرتا تھا جسے منہدم کر دیا گیا ہے اور صدر کے گھر کو بھی نئے سرے سے بنایا گیا ہے ۔ یہ اہم شاہراہ پر واقع ہے سڑک کے کنارے سے ہی ایک خوبصورت گیٹ نما تعمیر اور اس کے چاروں طرف فوارے، درمیان میں خوبصورت سبزہ زار اور ارد گرد بلند و بالا عمارتوں نے اس تفریح گاہ کو خاصا دلفریب بنا دیا ہے۔

اسی کے ساتھ شہیدوں کی یاد میں ایک میموریل اسکوائر ہے جو باغات کے درمیان ہے جس میں دونوں جانب دالان نما عمارت بنی ہوئی اس عمارت کے ہر حصے میں پیتل سے بڑے سائز کی کتاب بنائی گئی ہے ہر کتاب میں تقریباً بیس پیتل کے صفحات ہیں جن میں آزادی ازبکستان میں شہید ہوئے فوجیوں کے نام لکھے ہوئے ہیں ۔اس میدان کے ایک حصے میں عورت کا ایک بڑا مجسمہ بنایا گیا ہے جو ''ماں'' کی علامت ہے ۔اس مجسمے میں ماں اس بات کی بھی علامت ہے کہ ماں ان شہیدوں پر نازاں ہے۔لوگ اپنے شہیدوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے طرح طرح کے طریقے اپناتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ لوگ فوجیوں کے کے لباس کو زیب تن کر کے

ان کو یاد کرتے ہیں جس فوجی لباس میں وہ شہید ہوئے تھے۔مائیں عام دنوں میں بھی اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے یہاں فوجی لباس پہنا کر لاتی ہیں۔

ازبکستان میں 9 مئی کو ''وکٹری ڈے'' یوم آزادی کی تقریبات منائی جاتی ہے۔ یہ وہ دن ہے جس دن ازبکستان کے بہادر اور

جیالے افراد نے اپنی جانوں کی قربانیاں پیش کر کے اس ملک کو فاشزم سے نجات دلائی۔ ۹ مئی کو ہر سال بڑے اہتمام سے اس دن کو منایا جاتا ہے۔ صدر مملکت خود شریک ہوتے ہیں اور حکومت سے وابستہ تمام لوگوں کو لازمی طور پر شریک ہونا پڑتا۔اسی لیے یہ دن ازبکستان کے لیے فخر اور سربلندی کا دن تصور کیا جاتا ہے۔

اسی علاقے سے نزدیک امیر نوائی شاہراہ پر شہیدوں کا میدان واقع ہے۔ یہ وہ شہید ہیں جن کا آزادی سے قبل روسی حکومت نے قتل عام کیا۔ان کی یاد میں بنایا گیا اس پارک کے درمیان ایک نیلا گنبد ہے اور گنبد سے فراز کی جانب بڑا سا مصنوعی آبشار بنایا گیا ہے۔ جہاں آبشار ختم ہوتا ہے وہیں ایک بڑا قدرتی آبی ذخیرہ ہے۔

جو افراد شہید ہوئے ان کی قبروں کا پتہ نہیں چلتا کیونکہ اسے مسمار کر دیا گیا تھا لیکن۔ اسی احاطے میں ایک میوزیم بھی بنایا گیا ہے اس میوزیم میں روسی دور کے خاتمے اور ان کی شکست کی داستان سمجھ میں آتی ہے۔ یہاں آزادی سی جڑی یادگار اور اہم افراد کی تصویریں اور شکست خردہ روسی حکومت کی گاڑیاں اور اسلحے موجود ہیں۔اتفاق سے جس دن میں یہاں گیا وہ چھٹی کا دن تھا اور میوزیم بند تھا لیکن میرا اشتیاق تھا کہ اسے دیکھا جائے سو ہم نے وہاں موجود ایک نگہبان سے بات کی دوگنی فیس لے کر مجھے اور شاہجہاں کو اندر جانے کی اجازت مل گئی لیکن تصویر لینے سے منع کیا۔ یہ عمارت طرز تعمیر کے لحاظ سے خالص ازبکی طرز کی ہے جس میں لکڑیوں سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔

چند دنوں کی کلاس کی بعد طلبہ و طالبات مجھ سے بہت گھل مل گئے۔اس لیے انھوں نے ایک تجویز پیش کی کہ صرف شہاجہاں نہیں ہم بھی آپ کے ساتھ تاشقند کی سیر کو جائیں گے ۔ یہ میرے لیے خوشی کی بات تھی، میں نے ایک شرط رکھی کہ ہر طالب علم صرف اردو یا ہندی میں بات کریں گے، اگر یہ منظور ہے تو چلیں۔اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ طالب علم جو بولنے میں جھجک محسوس کر رہے تھے اس تفریح نے ان کی جھجک ختم کردی۔ ہم ان طالب علموں کے ساتھ غفور غلام پارک گئے دیر تک تفریح کے بعد اس پارک میں واقع ایک بڑے تالاب میں کشتیوں میں بیٹھ کر گھومنے کا لطف بھی لیا۔واقعی یہ طالب علم مجھے بہت عزیز ہیں کیونکہ انھوں نے بہت ہی اپنائیت اور احترام کے ساتھ میرا خیال رکھا۔

تاشقند شہر رقبے اور آبادی کے لحاظ اگرچہ چھوٹا ہے مگر اس شہر میں اتنی قدیم تاریخی عمارتیں اور قابل دید مقامات

ہیں کہ سب کو چند دنوں میں دیکھنا ناممکن ہے۔

سمرقند شہر اولیا و صوفیا

تاشقند کے بعد میری خواہش تھی کہ بلکہ ہندستان سے ہی ارادہ تھا کہ دو دن کے لیے ہی سہی مگر سمرقند اور بخارا ضرور جانا ہے۔ دہلی سے ہی میں نے اپنی میزبان ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا سے گزارش کی تھی کہ وہ کسی طرح میرے سفر کا انتظام کریں۔ انھوں نے ڈاکٹر لولا مکتوبہ صاحبہ سے ذکر کیا اور انھوں نے بڑی محبت سے اس سفر کا انتظام کیا۔ ڈاکٹر لولا مکتوبہ صاحبہ کا شکریہ لفظوں میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے یکم مئی سے چار مئی تک، چار دن کا پلان اس طرح مرتب کیا کہ کلاسیں بھی ناغہ نہیں ہوئیں۔ یہ سفر کافی آرام دہ اور آسان اس لیے ہوا کہ انھوں نے اپنے دو طالب علم جناب شاہ رخ اور احمد کو اس سفر میں میرے ساتھ کیا۔ احمد صاحب کی اپنی کار تھی اور وہ اسی علاقے سے تھے۔ دوپہر کی کلاس ختم ہوتے ہی لولا صاحبہ ہمیں اپنے ان دو طالب علموں کے ساتھ تاشقند کے ایک مشہور ریسٹورینٹ 'ریحان' لے گئیں اور پُر تکلف ظہرانے کے بعد ہمیں سمرقند کے لیے روانہ کیا۔ یہ طالب علم تیسری جماعت کے تھے۔ جب ان کے ہم جماعتوں کو معلوم ہوا کہ ہم سمرقند اور بخارا جا رہے ہیں تو دو طالبہ بھی ساتھ جانے کو تیار تھیں، لولا صاحبہ چونکہ طالب علموں کو اپنے بچوں کی طرح

رکھتی ہیں اس لیے ان بچوں نے بھی اسی طرح ضد کی، مگر ممکن نہیں تھا اس لیے وہ دلبرداشتہ ضرور ہوئیں لیکن لولا صاحبہ نے ان کی دلجوئی کی۔ خیر ہم تقریباً دو بجے تاشقند سے سمرقند کے لیے روانہ ہوئے۔ سمرقند کی دوری تین سو کیلو میٹر کی ہے۔ تاشقند سے سمرقند جانے والی شاہرہ آگے چل کر شاہراہ ریشم (سلک روٹ) سے مل جاتی ہے۔ یہ بہت ہی شاندار سڑک ہے اسی لیے یہ دوری ساڑھے تین گھنٹے میں طے ہو جاتی ہے۔ شہر سے نکل کر جب ہم کھلے راستے میں آئے تو دیکھا کہ سڑک کے دونوں کناروں میں تاحد نگاہ زرعی فارم یعنی کھیتیوں کا ایک سلسلہ ہے جو انتہائی سرسبز و شادب تھیں۔ سڑک کے کناروں پر کہیں چیری، کہیں پستہ، کہیں اسٹابیری، کہیں خوبانی کے باغات تھے تو کہیں دور دور تک گندم کی فصلیں لگی ہوئی تھیں اور کہیں سبزیاں تو کہیں کھیرے کی کھیتی ہو رہی تھی۔ ان کھیتوں میں مرد اور عورتیں کام کرتی دیکھائی دے رہی تھیں۔ چونکہ یہ اسٹابیری کا موسم تھا اس لیے اکثر جگہوں پر عورتیں باغ سے تازہ اسٹابیری توڑ کر بیچتی ہوئی نظر آئیں۔ یہ بڑا خوبصورت نظارہ تھا دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اللہ نے اس سرزمین کو کتنا زرخیز اور سرسبز و شاداب بنایا ہے۔ جب یہ سرزمین اتنی خوبصورت لگ رہی ہے تو جنت کتنی خوبصورت ہو گی۔ کچھ ہی دوری طے کی تھی جناب شاہ رخ نے بتایا کہ سر ہم شاہراہ ریشم پر آچکے ہیں اور اب اسی پر چلتے ہوئے سمرقند اور بخارا کا سفر کریں گے۔ میں کچھ دیر کے لیے ماضی کی تاریخ میں کھو گیا کہ یہ وہی صدیوں پُرانی شاہراہ ہے جس پر کتنے قافلوں اور کتنے حاکموں نے سفر کیا ہے اور کیا کیا تاریخیں رقم کی ہیں۔ ہم بڑے آرام سے کار میں بیٹھے ان نظاروں سے محظوظ ہو رہے تھے کہ 'جزاک' کی وادی پہنچ گئے۔ نشیب و فراز اور سرسبز و شاداب اس وادی کا نظارہ بڑا دلفریب تھا فراز کی جانب سفر کرتے ہوئے پہاڑ کے دامن میں بسی بستیوں کو دیکھ رہا تھا اور ان پر رشک کر رہا تھا کہ اللہ نے ان لوگوں کو کس قدر خوبصورت دنیا عطا کی ہے۔ جیسے ہی ہم فراز کی جانب آئے تو دریائے 'سنگ زار' کے پیچ و تاب نظر آئے جو اس کے خطے کے حسن میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ کچھ دور تک اس سنگ زار کے کنارے سفر کرتے رہے اور آخر کار سمرقند کی سرحدیں شروع ہو گئیں۔ دل مضطرب تھا اور اشتیاق کا عالم یہ

تھا کہ سورج غروب ہونے سے قبل ہم سمرقند پہنچ جائیں کیونکہ ہم نے تاشقند میں ہی یہ طے کیا تھا کہ شہر جانے سے قبل ہمیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مقدس پر حاضری دینی ہے۔

امام بخاری کمپلکس

امام بخاری کمپلیکس چونکہ سمرقند شہر سے تقریباً پچیس کیلو میٹر آگے ہے۔ وہاں سے ہمیں واپس سمرقند آنا تھا۔ شاہ رخ اور احمد صاحبان میرے اشتیاق کو شاید بھانپ گئے تھے اس لیے وہ بغیر کہیں رکے سیدھے امام بخاری کمپلکس لے کر پہنچے۔ ابھی عصر کی نماز میں کافی وقت تھا۔ گاڑی اسی احاطے میں بنی پارکنگ میں کھڑی کی گئی۔ یہاں سے گنبد نظر آرہے تھے میں نے دل دل میں امام بخاری کی بارگاہ میں سلام عقیدت پیش کیا۔ مزار کی جانب جو اندرونی سڑک تھی اس کے دونوں جانب دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر تو مجھے ہندستان جیسا لگا کیونکہ یہاں کی دکانیں بھی زیادہ تر تبرکات کی دکانیں تھیں بس فرق یہ تھا کہ یہاں پھول اور چادر کی دکانیں نہیں تھیں۔ خیر ہم مین دروازے تک پہنچ گئے جہاں کئی زبانوں میں بورڈ لگے ہوئے تھے جن میں زیارت کے آدب لکھے ہوئے تھے۔ ہم نے غور سے پڑھا جس

میں خاص طور پر لباس اور آداب زیارت سے متعلق ہدایات تھیں۔ دروازے پر اندر جانے کے لیے ٹکٹ لینے کے لیے کھڑکی تھی جہاں سے ہم نے ٹکٹ لیے۔ غیر ملکیوں کے لیے کچھ زیادہ رقم دینی ہوتی ہے اور مقامی لوگوں کے لیے کم، زیادہ تر زیارت گاہوں پر مقامی افراد کے لیے داخلہ مفت ہے۔ خیر سیکورٹی چیک کے بعد اندر داخل ہوئے۔ یہ بہت بڑا احاطہ ہے کچھ دوری پر عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ وضو خانے اور طہارت خانے بنے ہوئے تھے۔ ہم وضو کر کے ایک بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ سامنے امام بخاری کا روضہ نظر آیا۔ ہم نے تصویروں میں پہلے دیکھ رکھا تھا اب اپنی اصل آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اپنے محبوب بندے کی بارگاہ میں آنے کا شرف بخشا۔ یہ عمارت چاروں طرف سے الگ الگ عمارات کا حصہ ہے سامنے دو سو میٹر کی دوری پر امام بخاری کا مزار اور گنبد

ہے دائیں جانب وسیع و عریض مسجد ہے اور بائیں طرف میوزیم ہے۔امام بخاری کا مزار اندورونی حصے میں ہے باہر سے جو مزار دیکھائی دیتا ہے وہ دراصل ایک علامت کے طور پر ہے اسی کے نیچے اصل مزار ہے جہاں سب کو جانے کی اجازت نہیں، زائرین سامنے جاکر گنبد کے نیچے بنے مزار کے قریب جاکر فاتحہ پڑھتے ہیں۔اس کے تین طرف دالان نما عمارت بنی ہے جہاں زائرین کے لیے تلاوت یا فاتحہ پڑھنے کی جگہ بنی ہوئی ہے۔ازبکستان کی خاص بات یہ ہے کہ ہر مزار کے پاس اس طرح کی جگہ بنی ہوئی ہے جہاں حکومت کی جانب سے خدام متعین ہیں۔زائرین عام طور پر مزار کے قریب سلام کر کے گزرتے ہیں اور اس جگہ اجتماعی فاتحہ پڑھتے ہیں۔یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جب جگہ پُر ہو جاتی ہے تو خادم قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور فاتحہ پڑھتے ہیں، اس کے فوراً بعد دوسرا گروپ آجاتا ہے۔یہ انتظام بہت اچھا لگا۔میں بھی اجتماعی دعا میں شریک ہوا۔اس کے بعد ان خادم سے فارسی زبان میں بات کی، مجھے پہلے ہی بتایا گیا تھی کہ سمرقند اور بخارا میں کچھ لوگ فارسی زبان جانتے ہیں خاص طور پر جو تاجکی نسل کے ہیں۔اس لیے میں نے قیاساً فارسی میں بات کی اتفاق تھا کہ وہ فارسی جانتے تھے میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا ہم اندرونی

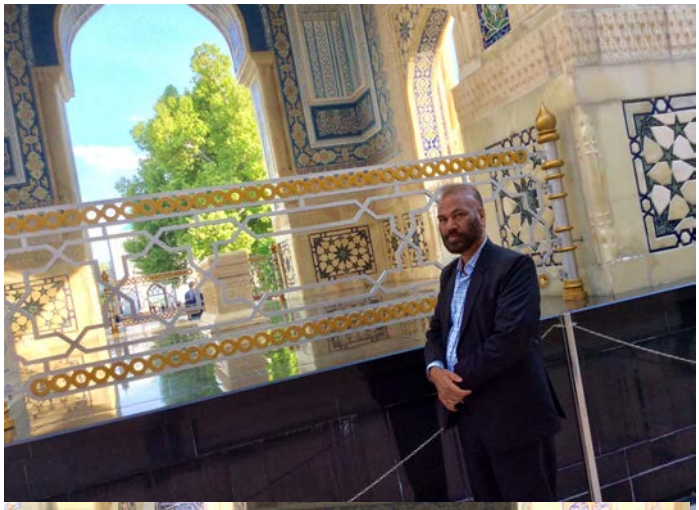

حصے میں جا سکتے ہیں جہاں مزار واقع ہے ۔ وہ تو پہلے مجھے حیرت سے دیکھنے لگے پھر پوچھا کہاں سے ہیں میں نے دہلی کا ذکر کیا تو وہ ایک بیرونی مہمان سمجھ کر بڑے اخلاق سے پیش آئے اور کہا یوں تو اجازت نہیں، آپ چاہیں تو جا سکتے ہیں مگر ابھی ممکن نہیں کیونکہ لوگوں کا اژدہام ہے یا تو مغرب کے فوراً بعد یا فجر کے وقت تشریف لائیں ۔ میرا دل چاہا کہ مغرب تک رک جائیں مگر ہمارے ساتھی کا خیال آیا کیونکہ دو گھنٹے یہاں رکنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ ابھی بات ہو ہی رہی تھی کہ عصر کی اذان ہونے لگی ہم مسجد کی جانب چلے۔ یہ بہت خوبصورت مسجد تھی اندر گنبد پر دیدہ زیب نقش و نگار بنے تھے۔ مسجد کے امام کو دیکھا جو خاص صوفیانہ لباس پہنے ہوئے تھے ان کے چہرے پر ایک خاص طرح کی نورانیت تھی۔ جماعت سے نماز پڑھی سلام کے بعد وہ دانھوں نے مقتدیوں کی جانب رخ کر کے پہلے کچھ وظیفے پڑھے اس کے بعد دعا کی میں اٹھنے ہی والا تھا کہ مؤذن صاحب ان کے مصلے کے پاس پہنچے اور انھوں نے بآواز بلند کچھ آیتیں اور وظائف کا ورد کیا اس کے بعد دوبارہ دعا ہوئی۔ اب میں اپنی جگہ سے اٹھ چکا تھا لیکن دیکھا کہ سب ابھی بھی مصلی پر بیٹھے ہوئے ہیں تو میں بھی بیٹھ گیا۔ امام صاحب نے پھر کچھ وظائف کا ورد کیا اس کے بعد تیسری دفعہ دعا ہوئی تب لوگ اٹھے۔ کچھ لوگوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا، میں نے بھی اگلی صف کے مصلیوں سے مصافحہ کیا۔ مسجد کے باہر آتے ہی سامنے ایک حوض تھا جس کے کنارے فوارے لگے ہوئے تھے، بہت سے مردوں اور عورتوں کو دیکھا کہ وہ اس سے پانی پی رہے ہیں۔ شاید متبرک مقام سمجھ کر ایسا کر رہے تھے، مجھے

بھی پیاس لگی تھی سو میں نے بھی بھجھکتے ہوئے پانی پیا لیکن پانی کا مزہ بہت اچھا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ امام بخاری کے مزار پر سلام کے لیے حاضر ہوا اس کے بعد قرآن میوزیم جو اسی احاطے میں واقع ہے اس کی زیارت کر کے باہر آئے۔

سمرقند میں مختصر قیام

لولا صاحبہ نے سمرقند میں پروفیسر جمعہ صاحب کو فون کر کے میری آمد کی اطلاع دی تھی اور یہ زحمت بھی کہ وہ ہمارا سمرقند میں خیال رکھیں۔ شہر پہنچ کر شاہ رخ صاحب نے ان سے بات کی شہر میں کسی جگہ ملنے کو کہا، کچھ دیر میں ان سے ملاقات ہوئی وہ بڑے خلوص اور اخلاق سے ملے پھر ساتھ آنے کو کہا ان کے ساتھ ہم ایک ہوٹل پہنچے جہاں انھوں نے ہمارے لیے ایک کمرہ بُک کرا رکھا تھا۔ کمرے کو دیکھنے کے بعد لگا کہ اس کا کرایہ بہت ہوگا مگر یہ توقع سے بھی بہت کم تھا۔ ہوٹل میں سامان رکھ کر پروفیسر جمعہ کو رخصت کیا۔ اس ہوٹل سے قریب ہی تقریباً تمام اہم مقامات تھے۔ سامان رکھ کر ہم بازار سیاب جو صدیوں پرانا بازار ہے یہ بازار سلک روٹ کی وجہ سے صدیوں پہلے یہاں بنا تھا۔ سلک روٹ کو کئی اعتبار سے اہمیت ہے یہ قدیم تہذیبوں کی ترقی اور جدید دنیا کی ترقی کا اشاریہ سمجھا جاتا ہے۔ دائرۃ المعارف کے مطابق ''عہدِ قدیم (Ancient Ages) کے ان تجارتی راستوں کو مجموعی

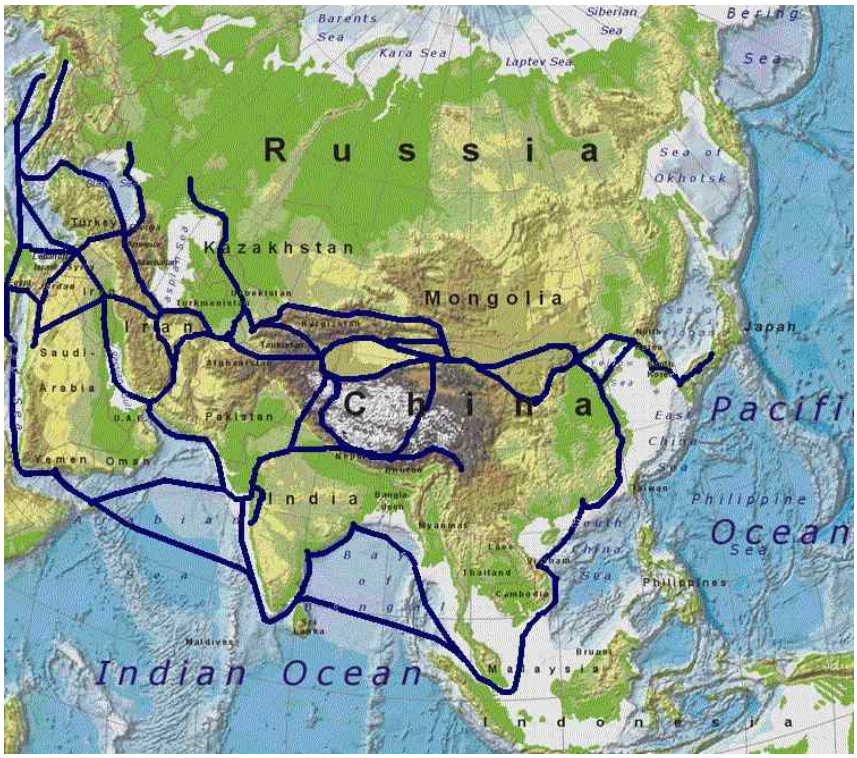

طور پر شاہراہ ریشم (انگریزی: Silk Road یا Silk route) کہا جاتا ہے جو چین کو ایشیائے کوچک اور بحیرہ روم کے ممالک سے ملاتے ہیں۔ یہ گزر گاہیں کل 8 ہزار کلو میٹر (5 ہزار میل) پر پھیلی ہوئی تھیں۔ شاہراہ ریشم کی تجارت چین، مصر، بین النہرین، فارس، بر صغیر اور روم کی تہذیبوں کی ترقی کا اہم ترین عنصر تھی اور جدید دنیا کی تعمیر میں اس کا بنیادی کردار رہا ہے۔ شاہراہ ریشم کی اصطلاح پہلی بار جرمن جغرافیہ دان فرڈینینڈ وون رچٹوفن نے 1877ء میں استعمال کی تھی۔ اب یہ اصطلاح پاکستان اور چین کے درمیان زمینی گزر گاہ شاہراہ قراقرم کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ مغرب سے شمالی چین کے تجارتی مراکز تک پھیلی یہ تجارتی گزر گاہیں سطح مرتفع تبت کے دونوں جانب شمالی اور جنوبی حصوں میں تقسیم ہیں۔ شمالی راستہ بلغار قپچاق علاقے سے گذرتا ہے اور چین کے شمال مغربی صوبے گانسو سے

گذرنے کے بعد مزید تین حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جن میں سے دو صحرائے ٹکلا مکان کے شمال اور جنوب سے گذرتے ہیں اور دوبارہ کاشغر پر آکر ملتے ہیں جبکہ تیسرا راستہ تین شان کے پہاڑوں کے شمال سے طرفان اور الماتی سے گذرتا ہے۔یہ تمام راستے وادی فرغانہ میں خوقند کے مقام پر ملتے ہیں اور مغرب میں صحرائے کراکم سے مرو کی جانب جاری رہتے ہیں اور جہاں جلد ہی جنوبی راستہ اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ایک راستہ آمو دریا کے ساتھ شمال مغرب کی جانب مڑ جاتا ہے جو شاہراہ ریشم پر تجارت کے مراکز بخارا اور سمرقند کو استراخان اور جزیرہ نما کریمیا سے ملاتا ہے۔یہی راستہ بحیرہ اسود، بحیرہ مرمرہ سے بلقان اور وینس تک جاتا ہے جبکہ دوسرا راستہ بحیرہ قزوین اور قفقاز کو عبور کر کے جارجیا سے بحیرہ اسود اور پھر قسطنطنیہ تک پہنچتا ہے۔شاہراہ ریشم کا جنوبی حصہ شمالی ہند سے ہوتا ہوا ترکستان اور خراسان سے ہوتا ہوا بین النہرین اور اناطولیہ پہنچتا ہے۔ یہ راستہ جنوبی چین سے ہندوستان میں داخل ہوتا ہے اور دریائے برہم پترا اور گنگا کے میدانوں سے ہوتا ہوا بنارس کے مقام پر جی ٹی روڈ میں شامل ہو جاتا ہے۔بعد ازاں یہ شمالی پاکستان اور کوہ ہندوکش کو عبور کر کے مرو کے قریب شمالی راستے میں شامل ہو جاتا ہے۔بعد ازاں یہ راستہ عین مغرب کی سمت اپنا سفر جاری رکھتا ہے اور شمالی ایران سے صحرائے شام عبور کرتا ہوا لیونتمیں داخل ہوتا ہے۔ یہاں سے بحیرہ روم میں بحری جہازوں کے ذریعے سامان تجارت اٹلی لے جایا جاتا تھا جبکہ شمال میں ترکی اور جنوب میں شمالی افریقہ کی جانب زمینی قافلے بھی نکلتے تھے۔"(بحوالہ: آزاد دائرۃ المعارف)

اسی سلک روٹ پر واقع یہ قدیم 'بازار سیاب' کے نام سے جانا جاتا ہے اب اس میں کچھ تبدیلی آگئی ہے لیکن جگہ وہی ہے، اسی کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کی۔ سامنے ہی سڑک کی دوسری جانب صدر ازبکستان اسلام کریمفوف کا مقبرہ اور اسی سے متصل مسجد خضر تھی جو کافی بلندی پر واقع ہے۔ چونکہ یہ چھوٹی پہاڑی کا سلسلہ ہے۔ ہم نے اندر جانے کا ارادہ کیا مگر گیٹ بند ہو چکا تھا اس لیے سڑک کی دوسری جانب اندر جاتی ہوئی سڑک کی طرف چل پڑے دور سے ہی امیر تیمور کے عہد کی جامع مسجد جو بی بی خانم مسجد کے نام سے مشہور ہے کے نیلے گنبد و مینار نظر آئے اور دوسری جانب بی بی خانم کا مقبرہ۔ شام کے وقت اس کا نظارہ بڑا دلفریب تھا۔ مینار کی بلندی اور گنبد کی جلوہ ریزی اس ملک کی شاندار ماضی کی داستان سنا رہی تھی۔ ہم نے ٹکٹ لیا اور جامع مسجد میں داخل ہوئے۔ دائرۃ المعارف کے مطابق "بی بی خانم مسجد ازبکستان کی مشہور تاریخی مسجد ہے جو 14 ویں صدی کے عظیم فاتح امیر تیمور نے اپنی اہلیہ سے موسوم کی تھی۔ تیمور نے 1399ء میں ہندوستان کی فتح کے بعد اپنے نئے دار الحکومت سمرقند میں ایک عظیم مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بنایا۔ اس مسجد کا گنبد 40 میٹر اور داخلی راستہ 35 میٹر بلند ہے۔ جبکہ دوسری روایت کے مطابق بی بی خانم مسجد امیر تیمور کی بیویوں میں سے ایک نے اس وقت تعمیر کروائی تھی جب وہ جنگ پر نکلے ہوئے تھے۔ یہ مسجد انیسویں صدی میں زلزلے میں تباہ ہو گئی تھی جو بعد میں 1970 کی دہائی میں بحال کی گئی۔ اس مسجد کی تعمیر 1399ء میں شروع اور 1404ء میں مکمل ہوئی۔" سڑک کی دوسری جانب بی بی خانم

کا مقبرہ ہے جس میں امیر تیمور کی دو بیویوں اور اب کی خاص خادمہ کی قبریں ہیں۔اسی سڑک سے ایک کیلو میٹر کی دوری پر سمرقند کی مشہور عمارت ریگستانا سکوائر میں مسجد و مدرسہ ہے۔چونکہ رات ہو چکی تھی اس لیے ریگستان جانے کا پروگرام ملتوی کیا۔

اس کے بعد احمد اور شاہ رخ کے ساتھ سمرقند شہر کار سے ہی گھومتے رہے۔کچھ دیر بعد احمد صاحب نے ایک ریسٹورینٹ کے سامنے کار روکی اور کہا یہیں کھانا کھائیں گے، یہ بہت بڑا ریسٹورینٹ تھا جو سیاحوں سے بھرا پڑا تھا۔ہمیں باہر ہی سائبان میں بیٹھنے کو جگہ ملی۔ رات ہو چکی تھی اور خنکی بڑھ گئی تھی دیکھا کہ جو بھی سیاح سائبان میں لگی کرسیوں پر بیٹھ رہے تھے ان کے لیے ویٹر پہلے کمبل نما چادر لا کر ان کو بڑے اہتمام سے اوڑھا رہے تھے۔اس کے بعد کھانے کا آڈر لیتے۔یہاں کے کھانے بہت مشہور ہیں اسی لیے زیادہ تر سیاح یہاں کھانے کے لیے آتے ہیں۔کھانے کے بعد ہم ہوٹل پہنچے اور آرام کیا۔احمد صاحب کسی دوست کے یہاں چلے گئے، میں اور شاہ رخ ایک ساتھ رکے۔

شاہ زندہ

صبح طے شدہ وقت پر ہم تیار ہوئے پہلے ہم شاہ زندہ کمپلکس پہنچے۔سمرقند میں شاہ زندہ کا احاطہ بہت وسیع و عریض علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔یہ حضرت قثم بن عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالی عنہ کی نسبت سے 'شاہ زندہ' کہلاتا ہے۔آپ حضور اکرم ﷺ کے چچا زاد بھائی تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہاں آئے۔مشرق وسطیٰ میں دین اسلام کی تبلیغ کے لیے سب سے پہلے آپ کی ہی آمد ہوئی۔آپ نے عمر کے آخری حصے تک دین کی تبلیغ کی اور یہیں شہادت پائی۔آپ کے حوالے سے بہت مشہور ہے کہ اس وقت کے حاکم وقت نے آپ کو قید کرنے اور پھانسی کا حکم دیا تو جب سپاہی قریب آئے تو یہ اپنے حجرے سے باہر نکلے اور حجرے کے قریب ہی ایک کنواں بنوایا تھا جس سے لوگ سیراب ہوتے تھے جو نشیب میں واقع تھا،اس کنویں کی جانب

اترے اس کے بعد پھر نظر نہیں آئے،اسی لیے انہیں شاہ زندہ کہا جاتا ہے۔اس احاطے میں ان کا کوئی مقبرہ نہیں ہے بلکہ عبادت کرنے کا حجرہ اور اسی کے ساتھ منسلک مسجد ہے جہاں لوگ جاتے ہیں اور فاتحہ پڑھتے ہیں۔وہ کنواں بھی موجود ہے لیکن عام لوگوں کو بتایا نہیں جاتا

اور اسے ڈھک دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پیغمبر حضرت خضر علیہ السلام تشریف لائے اور انھوں نے حضرت قثم کے روپوش ہونے میں رہبری کی۔(واللہ اعلم بالصواب)اسی لیے اس احاطے سے کچھ دوری پر جو مسجد واقع ہے اسے مسجد خضر کہتے ہیں۔

اس احاطے میں سینکڑوں قبریں ہیں یہاں تیمور کے حکم سے بہت سے مقبرے گنبدوں کے ساتھ بنائے گئے ہیں ۔ یہ سڑک کے کنارے سے پہاڑ کی بلندی کی جانب ہے اسی لیے حضرت قثم بن عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالی عنہ کا حجرہ سب سے بالائی حصے میں ہے۔اس پر جانے والی سیڑھیوں کے حوالے سے مشہور ہے کہ اوپر جاتے وقت یہ 36 سیڑھیاں ہوتی ہیں اور اترتے وقت 37 سیڑھیاں۔ میں نے بھی کوشش کی کہ گنا جاسکے مگر ممکن نہ ہو سکا۔اب اس میں کتنی سچائی ہے یہ نہیں کہا جاسکتا مگر یہ بات یہاں بہت مشہور ہے۔

مسجد خضر

شاہ زندہ سے سے متصل ہی مسجد خضر ہے۔ یہ دونوں مقامات بلندی پر واقع ہیں یہ چھوٹی پہاڑی تھی۔ دونوں عمارتوں کے درمیان اس چھوٹی پہاڑی پر قدیم قبرستان ہے۔ ویسے ازبکستان میں زیادہ تر قبرستان چھوٹی پہاڑیوں پر ہی ہیں۔ خیر بلندی کی طرف جاتے ہوئے اور عمارت کی کئی سیڑھیوں کو طے کرنے کے بعد ہم اس کمپلکس کے اندر داخل ہوئے۔ بائیں جانب مسجد خضر ہے۔روایت ہے کہ یہاں اسلام کی آمد سے قبل بت خانہ تھا جسے منہدم کر کے مسجد بنائی گئی ہے۔ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہاں

حضرت خضر علیہ السلام تشریف لائے تھے ان کی تشریف آوری کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت قثم رضی اللہ تعالی عنہ کو

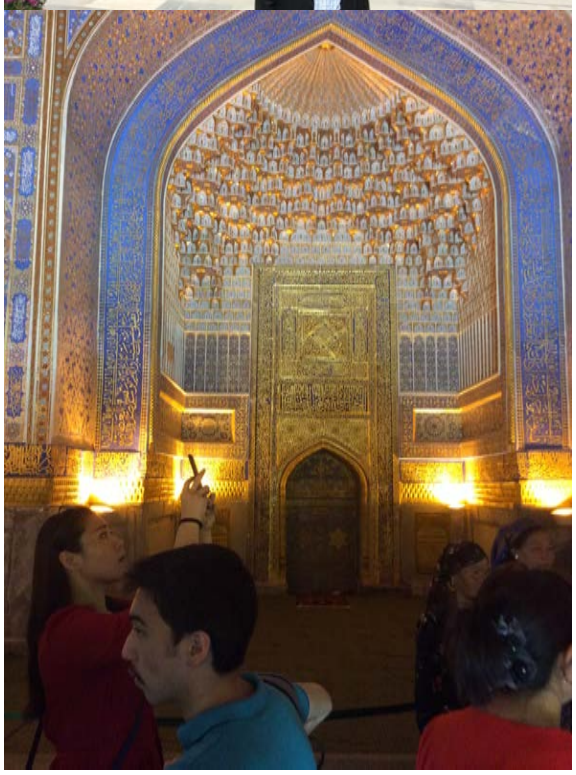

سزائے موت سنائی گئی تھی تو حضرت خضر نے ہی اللہ کے حکم سے ان کی روپوشی میں مدد کی تھی۔اسی لیے اس مسجد کا نام شروع سے ہی مسجد خضر ہے۔ یہ مسجد بہت بڑی نہیں ہے لیکن مسجد کی آخری دیوار کے دونوں جانب دو چھوٹے چھوٹے حجرے بنے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام یہاں عبادت کرتے تھے۔ان میں ایک حجرے میں ایک عصار کھا ہوا ہے روایت یہ ہے کہ مسجد کی تعمیر کے وقت حضرت خضر کا یہ عصا کہیں گم ہو گیا تھا بعد میں تاشقند میں مقیم ایک خاتون جو اپنے وقت کی ولیہ تھیں،ان کے خواب میں حضرت خضر نے اس عصا کی نشاندہی کی۔ اس خواب کے بعد وہ سمرقند آئیں،ان کی نشاندہی پر یہ عصا کہیں زمین کے اندر موجود تھا اس کی بازیافت ہوئی۔(واللہ اعلم بالصواب)۔اسی لیے یہ مسجد حضرت خضر کے نام سے موسوم ہے۔ بڑی تعداد میں زائرین یہاں آتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں،اب بھی دونوں حجرے موجود ہیں جو ایک عورتوں کے لیے اور دوسرا مردوں کی عبادت کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔اللہ نے اس مسجد کی زیارت کی مجھے توفیق دی۔دو رکعت نفل ادا کر کے اسی سے متصل سابق صدر ازبکستان اسلام کریموف کے مزار کے پاس گیا جہاں تصویر لینے کی سخت ممانعت تھی۔ یہاں ایک وسیع احاطے میں ہر جگہ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔زائرین آتے اور اپنی جگہ لیتے، جب ساری جگہیں پُر ہو جاتیں تو اسی قاعدے کے مطابق اجتماعی فاتحہ خوانی ہوتی۔

ریگستان اسکوائر

مسجد خضر سے نشیب میں سڑک کی دوسری جانب چل کر اس سڑک پر پہنچے جہاں بی بی خانم مسجد واقع ہے یہی سڑک ریگستان کو جاتی ہے

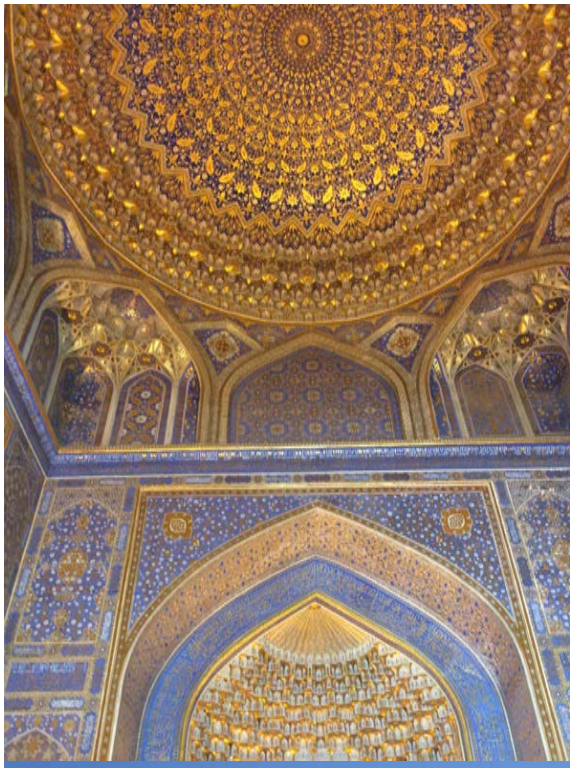

اکثر لوگ پیدل ہی جا رہے تھے۔ ہمیں دوری کا اندازہ تھا اس لیے بیٹری والی گاڑی سے وہاں تک پہنچے۔ ریگستان کا لفظ سننے اور پڑھنے میں کچھ اور تصور قائم ہوتا ہے لیکن یہاں معاملہ بالکل جداگانہ تھا۔ ایک وسیع و عریض میدان کے تینوں جانب بلند و بالا اور شاندار مسجد و مدرسہ کی عمارتیں واقع ہیں۔ یہ کمپلکس ازبکستان کی ایک شناخت بھی ہے۔ اسے ریگستان اسکوائر بھی کہتے ہیں۔ لیکن عام زبان میں یہ ریگستان کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔ اس میدان میں تین الگ الگ عمارتیں ہیں۔

دائیں جانب ''مدرسہ الغ بیگ'' سامنے ''مدرسہ شیر دار'' اور درمیان میں ''مسجد طلاکاری'' ہے۔ مدرسہ الغ بیگ 1417 میں تعمیر ہوا اس میں پچاس کمرے ہیں۔ ہر کمرے میں دو طالب علم رہتے تھے، دن میں یہی درسگاہ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ یہ اس وقت کی سب سے عظیم دانشگاہ تھی یہاں جدید مذہبی تعلیم کے علاوہ اس کے وقت کے مروجہ علوم و فنون کی تعلیم ہوتی تھی اس عہد کے عظیم شاعر، فلسفی، ماہر فلکیات اور دانشوروں کا تعلق اسی مدرسے سے تھا اسی لیے اس کو اس عہد کا عظیم سائنسی درسگاہ کا درجہ حاصل تھا۔ شیر دار مدرسہ 1619 میں سمرقند کے مشہور سیاست داں شیر دار خان نے بنوایا۔ اس مدرسے کے بڑے دروازے پر شیر کا نشان بنا ہوا ہے۔ طلاکاری مدرسہ و مسجد بھی اسی کی تعمیر کردہ ہے جس کی تعمیر 1646 میں شروع ہوئی اور 1660 میں مکمل ہوئی۔ اس مسجد کے محراب اور گنبد میں خالص سونے سے نقاشی کی گئی ہے اسی لیے اسے طلاکاری کہا جاتا ہے۔ اسے احاطے میں ایک باغ بھی ہے جو انواع و اقسام کے پھولوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس احاطے میں داخل ہوں تو آنکھیں خیرہ رہ جاتی ہیں کہ اس زمانے میں اتنی عظم الشان عمارتیں کیسے بنوائی گئی ہوں گے۔ اب تو ان مدرسوں کے کمرے دکانوں میں تبدیل ہو گئے ہیں اور اب یہ خالصتاً سیاحی مرکز بن

گیا ہے۔ یہاں موجود دکانیں ازبکستان کی صنعت کاری سے متعلق ہیں جدید طرز بازار نہیں ہے۔اس کو دیکھنے کے لیے دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں اور یہ اب عالمی ورثے میں شمار ہوتا ہے۔

امیر تیمور کا مقبرہ

ازبکستان کو امیر تیمور نے بہت کچھ دیا اس کے عہد میں جتنی عمارتیں بنی ہیں شاید اور کسی حکمراں کے عہد میں نہیں بنیں۔

تیمور کا شمار دنیا کے عظیم فاتحوں میں ہوتا ہے۔ سمرقند میں واقع امیر تیمور کا مقبرہ بھی زائرین کی توجہ کا مرکز ہے۔اسی طرز کے گنبد و مینار بنے ہوئے ہیں لیکن اندرونی گنبد پر جو نقش و نگار ہیں وہ حیرت زدہ کرتے ہیں۔ سونے اور دیگر قیمتی دھاتوں سے نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ اس میں امیر تیمور کے علاوہ اس کے خاندان کے افراد کی قبریں موجود ہیں۔

اللہ کے نبی حضرت دانیال علیہ السلام کے مزار مبارک پر

سمرقند کے بیرون شہر پہاڑی پر یہ مقام واقع ہے۔اس کے نیچے خوبصورت نہر بہہ رہی ہے۔اس کے قریب ہی ایک چشمہ ہے جو مستقل جاری ہے، یہ چشمہ بھی لوگوں کی عقیدت کی جگہ ہے ہر زیارت کرنے والے اس کا پانی پیتے ہیں،اس پانی کو شفا مانتے ہیں۔ مسلم، عیسائی اور یہودی تینوں اقوام حضرت دانیال کو اپنا نبی مانتے ہیں اسی لیے مسلمانوں کے علاوہ وہ بھی بڑی تعداد میں زیارت کے لیے آتے ہیں۔حضرت دانیال کی قبر انور کے بارے میں اختلاف ہے۔۔میں خود مصر کے قدیم شہر اسکندریہ

میں حضرت دانیال کے مزار پر حاضری دے چکا ہوں۔ وہاں ان کی قبر مبارک کے ساتھ حضرت لقمان کی بھی قبر ہے لیکن سمرقند میں ان کی قبر کی لمبائی سترہ میٹر ہے۔

حضرت دانیال کی قبر لمبائی سترہ میٹر کیوں ہے؟ اس کے متعلق ایک روایت یہ ہے کہ بادشاہ کے حکم سے اتنی لمبی قبر بنائی کیونکہ

عیسائی۔ یہودی سب عقیدت کرتے تھے اور کچھ لوگ پوجنے بھی لگے تو بادشاہ نے کسی اور جگہ سے منتقل کر کے قبر یہاں بنوائی اور لمبائی اتنی رکھی تاکہ کسی کو اصل قبر کس جگہ ہے اس کا علم نہ ہو سکے۔ حضرت دانیال کی قبر مبارک کے حوالے سے ایران کے علاقہ شوش میں بھی دعوی کیا جاتا ہے۔

حضرت دانیال علیہ السلام کے مزار مبارک کے پائین میں واقع یہ وہ چشمہ ہے جس کے متلعق مشہور ہے کہ اس پانی میں شفا ہے اسی لیے یہاں ہر وقت ہجوم رہتا ہے اور بلا امتیاز مذہب و ملت لوگ اس پانی کو پیتے پیتے ہیں اور بوتلوں میں بھر کر بھی لے جاتے ہیں۔ مزار مبارک پہاڑی کی بلندی پر ہے اور یہ چشمہ اسی کے نیچے کچھ دوری پر جاری ہے۔

بخارا روانگی

سمرقند میں حالانکہ اور بھی کئی مقامات تھے مگر ہمارے پاس وقت کم تھا شام سے پہلے بخارا پہنچنا تھا اس لیے دوپہر کا کھانا کھانے کے فوراً بعد ہم بخارا کی جانب روانہ ہوئے اسی شاہراہ ریشم پر چلتے اسی طرح کے دلفریب نظارے اور دلکش قدرتی مناظر، پستہ، بادام، اسٹابیری، چیری، خوبانی اور انواع واقسام کی کھیتوں سے لہلہاتی سرزمین۔ لیکن اس سرزمین کی روحانی کشش بھی تھی۔ راستے کا احساس بھی

نہ ہوا تقریباً دو سو ستر کیلو میٹر کا راستہ کب اور کیسے ہوا۔

بخارا جانے کا ایک اور بھی مقصد تھا۔ اور نیٹل اسٹڈیز میں لولا صاحبہ سے دوران گفتگو ازبکستان کی شادی کا ذکر آیا تو میں نے بڑے اشتیاق سے یہاں کی رسم ورواج کے بارے میں دریافت کیا۔ لولا صاحبہ نے کہا کہ کیا آپ ازبکستان کی شادی دیکھنا چاہتے ہیں؟ میں نے فوراً ہاں کر دی تو انھوں نے دوسرے دن مجھے بتایا کہ آپ کے لیے ہم نے ایک پلان مرتب کیا ہے۔ پھر یہ طے ہوا کہ ہم سمرقند ہوتے ہوئے 2 مئی کو بخارا جائیں گے۔ اصل میں انھوں نے اپنے ایک طالب علم رمز الدین سے بات کی ان کے بھائی کی شادی ہو رہی تھی سو انھوں نے اس میں شریک ہونے کی دعوت ان کے توسط سے مجھے دی اور ان کے بخارا میں مقیم طالب علم رمز الدین جو ابھی پونا۔ انڈیا سے بی۔ بی۔ اے کا کورس کر رہے ہیں انھیں کے گھر قیام کا انتظام کیا اس طرح میں نے بخارا کی روحانی سیر بھی کی اور ازبکستان میں شادی کے رسوم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکا۔ اسی پروگرام کے مطابق ہم 2 مئی کی شام رمز الدین کے گھر پہنچ گئے۔ احمد صاحب ہمیں رخصت کر کے اپنے گھر کو چلے گئے۔ رمز الدین کے اہل خانہ نے ہمارا پُر تپاک خیر مقدم کیا۔ ایک غیر ملکی مہمان کی آمد پر سب کے سب خوش تھے۔

دل کو چھو جانے والی چند رسمیں

مہمان خانے میں ہمیں عزت سے بیٹھایا گیا۔ عام طور پر ازبکستان اور میں نے ایران میں بھی ایسا ہی دیکھا گیا ہے کہ کمرے میں کوئی فرنیچر نہیں ہوتا۔ فرش پر دبیز قالین بچھی ہوئی تھی اور کمرے کے چاروں طرف آرام دہ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی دستر خوان سجا دیا گیا انواع واقسام کے میوے، چاکلیٹ، شیرینی اور ازبکی روٹیاں اور گرین چائے سے ضیافت ہوئی۔ لیکن جو بات مجھے بالکل نئی اور بہت اچھی لگی وہ یہ تھی کہ میرے بیٹھتے ہی دعا کرنے کو کہا گیا میں سمجھا نہیں لوگوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھادئے سو میں نے کچھ دعائیں پڑھیں۔ اس کے بعد جو بھی ملنے آتے سلام اور مصافحہ کے بعد میرے قریب بیٹھ جاتے اور دعا کے لیے کہا جاتا۔ میرے ہمراہ شاہ رخ نے بتایا کہ سر یہ ہمارا دستور کے ہے کہ گھر میں جب بھی کوئی آتا ہے تو سب مل کر خیر کی دعا کرتے ہیں اور آنے والا اگر بڑا ہے تو ان سے دعا کے لیے کہا جاتا ہے یا جو محفل میں سب سے اہم ہوتے ہیں ان سے دعا کے لیے کہا جاتا ہے۔ واہ واہ یہ رسم دیکھ کر دل بہت خوش ہوا میں نے کسی اسلامی ملک میں بھی ایسی رسم نہیں دیکھی ہے۔ اللہ سلامت رکھے اس ملک کو اور اس ملک کے باشندوں کو۔

کچھ دیر ہم نے گفتگو کی اور آرام کیا مغرب بعد رمز الدین کے چچا ملنے تشریف لائے، ان کے آتے ہی دعا ہوئی اور بڑی محبت سے

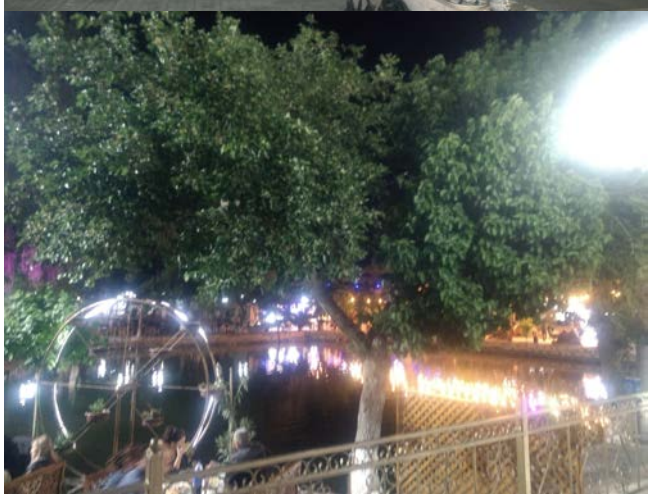

باتیں ہوئیں۔ نہ میں ان کی زبان سمجھتا تھا اور نہ وہ میری زبان سمجھتے تھے مگر خدا بھلا کرے شاہ رخ کا کہ وہ سائے کی طرح ہمارے ساتھ رہے اس لیے ان کے توسط سے ہماری باتیں ہوتی رہیں ہم اردو بولتے تھے اور شاہ رخ ازبکی میں اس کا ترجمہ کرتے تھے۔ پھر ان کے ساتھ رات میں بخارا شہر گھومنے کا پلان بنا۔ رمز الدین کا گھر بخارا کے نئے علاقے میں واقع تھا جو پرانے شہر سے کچھ دوری پر تھا۔ بخارا پہنچ کر اندازہ ہوا کہ کتنی تیزی سے اس شہر کی توسیع ہو رہی ہے اور بڑی بڑی کالونیاں بن رہی ہیں۔ لیکن مکانات کی زیب وزینت اور آرائش میں کوئی کمی نہیں جبکہ کہا جاتا ہے کہ ازبکستان کی اقتصادی حالت بہت اچھی نہیں لیکن ان کی رہائش کا معیار اور مکانات دیکھ کر کوئی ایسا نہیں کہہ سکتا۔ یہ کیسے

ممکن ہوتا ہے اللہ ہی جانے۔

ان کے ہمراہ ہم بخارا کے لعبی حوض(Lyab-i-Hauz)' پہنچے یہ قدیم عمارتوں کی جگہ ہے۔اسی کے سامنے مدرسہ اور دیگر عمارات موجود ہیں اسی کے آس پاس قدیم بازار اور سرائے ہیں۔رات کافی خوشگوار تھی کچھ دیر ہم تفریح کرتے رہے۔رات کو دیر سے گھر واپس آئے رمز الدین کے گھر والوں نے پُر تکلف کھانا بنا رکھا تھا۔کھانے کے بعد یہ طے ہوا کہ صبح پانچ بجے رسم کے لیے دلہن کے گھر کے جانا ہے اس رسم کو 'مردانہ پلاؤ' کی رسم کہا جاتا ہے۔اس لیے جلدی ہی سو گئے۔

مردانہ پلاؤ کی رسم

ازبکستان میں ''مردانہ پلاؤ'' کی رسم ہے۔میں بھی اس رسم کو دیکھنا چاہتا تھا۔اس رسم کے مطابق لڑکے والے لڑکی کے گھر والوں اور رشتہ داروں کو صبح ناشتے کے وقت پلاؤ کی دعوت پر بلاتے ہیں۔پلاؤ ازبکستان کی سب سے مرغوب، مشہور اور پسندیدہ غذا ہے۔اس میں گوشت

وغیرہ کے علاوہ ایک خاص پرندے کے چھوٹے چھوٹے اُبلے ہوئے انڈے شامل کیے جاتے ہیں۔اس رسم کا مطلب یہ ہے کہ لڑکی کی رخصتی سے ایک دن قبل لڑکے والے دلہن کے گھر کے قریب کسی ہوٹل یا شادی گھر میں دعوت کا اہتمام کرتے ہیں، لڑکی والے اپنے رشتہ داروں کو دعوت دیتے ہیں اس دعوت میں مرد ہی شامل ہوتے ہیں البتہ لڑکی کی والدہ کے علاوہ قریبی خواتین موجود ہوتی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔میں نے جب دریافت کیا کہ اسے مرد ادنہ پلاؤ کیوں کہا جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ پہلے اس دعوت میں صرف مرد شامل ہوتے تھے لیکن اب گزرتے وقت کے ساتھ کچھ تبدیلیاں آرہی ہیں۔

دلہن کا گھر چونکہ دور تھا اس لیے ہم صبح پانچ بجے ہی روانہ ہوئے۔سات بجے تک اس جگہ پہنچ گئے۔گیٹ پر لڑکے اور لڑکی کے والد مہمانوں کا استقبال کررہے تھے۔ہم شاہ رخ کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ گئے۔ہر جگہ گول میز ہی لگے ہوئے تھے جس کے ساتھ تقریباً آٹھ کرسیاں تھیں۔ہم جب بیٹھے تو صرف دو تھے، لوگ آتے گئے اور تعداد بڑھتی گئی۔ہمارے میز پر ہر آنے والے پہلے دعا کرتے۔بہت اچھا لگتا لوگ آتے سب کو سلام کرتے، بیٹھے ہی دعا کی جاتی۔کھ دیر بعد کھانے کا سلسلہ شروع ہوا اور ساتھ ہی ایک شخص اسٹیج پر ازبکی نغمے گارہا تھا۔کھانے سے پہلے دلہے کو مخصوص لباس پہنایا گیا۔عام لوگوں کے چلے جانے کے بعد گھر کی عورتوں نے خوب رقص کیا پھر محفل برخواست ہوئی۔میں نے شاہ رخ سے پوچھا کہ یہاں تو لڑکی والوں کا گھر نزدیک تھا اس لیے آئے اور واپس آگئے اگر خدانخواستہ کسی دوسرے شہر میں ہو تو کیسے یہ رسم کی جاتی ہے۔شاہ رخ نے بتایا کہ دور ہو تب بھی لڑکے والے جاتے ہیں اور یہ رسم کر کے واپس آتے ہیں۔اس رسم کے بعد دلہن کو رخصت نہیں کیا جاتا بلکہ دوسرے دن رخصتی ہوتی ہے اور ان رسموں سے ایک ہفتہ پہلے ہی نکاح ہو جاتا ہے۔اس رسم کے بعد گھر کے لوگ واپس ہو گئے لیکن میں نے غجدوان میں واقع حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی کے مزار پر حاضری کا پروگرام بنایا جو یہاں سے قریب ہی تھا۔

سات خواجگان کا شہر بخارا

اس جگہ کا نام غجدوان ہے جو بخارا شہر سے تقریباً پچاس کیلو میٹر کی دوری پر ہے۔یہ شہر خواجۂ جہان خواجہ عبد الخالق غجدوانی کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ان کے علاوہ ان کے سلسلے کے چھ اور خواجہ بخارا کے مضافات میں ہیں اسی وجہ سے

بخارا کو سات خواجگان کا شہر کہا جاتا ہے۔ خواجہ عبد الخالق غجدوانی علیہ الرحمۃ والرضوان کی پیدائش ماوراءالنہر کے عظیم مشائخ اور نقشبندی سلسلے کے پیر طریقت میں سے ایک ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی ولادت سے قبل ان کے والدین کو بشارت ہوئی تھی کہ تمہارے گھر ایک چراغ روشن ہونے والا ہے جو ایک ایک عالم کو روشن کرے گا اور بشارت میں ہی ان کا نام عبد الخالق رکھنے کو کہا گیا تھا۔ ان کی پیدائش کے کچھ ہی دنوں بعد ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا، جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو والدہ نے ان کو مفسر قرآن حضرت امام صدر الدین کی تربیت میں دیا۔ ان کی وفات کے بعد آپ نے خواجہ یوسف ھمدانی سے بیعت و خلافت حاصل کی۔ عمر بھر تبلیغ دین میں مصروف رہے آپ کی ولایت کے چرچے دور دور تک تھے اسی لیے بڑی تعداد میں لوگوں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ 616 ہجری میں وفات پائی۔ آپ کو خواجۂ دو جہان بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے مزار پر زائرین کی بڑی تعدد رہتی ہے۔ ازبکستان کے علاوہ سینٹرل ایشیا سے لوگ جوق در جوق آتے ہیں۔ زائرین میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ دوسری جگہوں کے مزارت پر بھی میں نے عورتوں کی تعداد زیادہ دیکھی۔

یہاں سے حاضری کے بعد حضرت خواجہ انجیر فغنوی پر حاضری ہوئی ہے یہ جگہ وہاں سے تقریباً بیس کیلو میٹر کی دوری پر

واقع ہے۔ وہیں سے دس کیلو میٹر کی دوری پر حضرت خواجہ عارف ریو گری کے بارگاہ میں حاضری کا موقع ملا۔ یہ جمعہ کا دن تھا اس لیے ہم لوگوں نے ارادہ کیا کہ حضرت خواجہ شیخ بہاء الدین نقشبندی کے مزار پر جائیں گے اور وہیں جمعہ کی نماز ادا کی جائے گی۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی رحمتہ اللہ علیہ کا مزار مبارک اور ان کی والدہ محترمہ کا مزار مبارک ایک وسیع و عریض کیمپس میں واقع ہے جس میں عالی شان مسجد اور صوفی خانقاہ میوزیم موجود ہے۔ اس کے عقب میں قدیم قبرستان ہے جس میں نجانے کتنے اولیاء و اصفیاء مدفون ہیں۔ یہ وہی عالی مرتبت بزرگ ہیں جن سے نقشبندیہ سلسلہ شروع ہوا، جن کا سلسلہ ہندستان اور پاکستان میں موجود ہے اور پوری دنیا میں کروڑوں لوگ اس سلسلے کے عقیدت مند ہیں۔ ان کی مختصر تفصیلات اردو ویکی پیڈیا آزاد دائرۃ المعارف میں یوں درج ہے۔" خواجہ خواجگان بہاؤالدین نقشبند بخاری نقشبندی (پیدائش: نومبر 1327ء— وفات: 21 فروری 1390ء) مسلم صوفی سلسلہ نقشبندیہ کے بانی تھے۔ یہ سلسلہ پوری دنیا میں سب سے زیادہ مقبول اور بڑا سلسلہ مانا جاتا ہے۔ سلسلہ مجددیہ، سلسلہ خالدیہ، سلسلہ سیفیہ اس کی مشہور شاخیں ہیں۔ آپ کا اسم شریف محمد اور والد گرامی کا نام بھی محمد ہے۔ آپ کا تعلق سادات خاندان سے ہے۔ اسلامی تاریخی شہر بخارا سے تین میل کے فاصلہ پر قصر ہندواں نیا نام قصر عارفاں نامی قصبہ میں محرم الحرام 728 ہجری میں پیدا ہوئے۔ محمد بن محمد بہاؤ الدین البخاری سلسلہ نقشبندیہ کے بانی ان کا لقب شاہ نقشبند (لفظی معنی: مصور) کی تشریح علم الٰہی کی لاثانی تصویر کھینچنے والا سے کی گئی۔ یا زیادہ صوفیانہ انداز میں اپنے دل میں کمال حقیقی کا نقش رکھنے والا۔ انہیں الشاہ کا جو لقب دیا گیا ہے اس سے مراد روحانی رہبر ہے۔ نسبت الاویسی سے یہ مراد ہے کہ ان کی نسبت روحانی براہ راست حضرت سیدنا خضر علیہ

السلام اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے تھی۔ بچپن ہی سے آپکی پیشانی پر آثار ولایت و ہدایت نمایاں تھے اور یہ کیوں نہ ہوں جبکہ آپکی ولادت سے بھی پہلے وہاں سے گذرتے ہوئے قطب عالم محمد باباسماسی نے فرمایا تھا کہ مجھے یہاں سے ایک مرد خدا کی خوشبو آتی ہے۔ ایک اور مرتبہ فرمایا اب وہ خوشبو زیادہ ہو گئی ہے اور جب آپ پیدا ہوئے اور دعا کے لیے آپ کے پاس لائے گئے تو انہیں اپنی فرزندی میں قبول فرمایا اور توجہات سے نوازا۔ اس طرح شاہ نقشبند کی ابتدائی روحانی تربیت قطب عالم باباسماسی نے کی اور بعد میں آپ کو سید امیر کلال کے سپرد فرمایا۔ گو آپ نے ظاہری طور پر طریقت کی تعلیم و تربیت سید امیر کلال سے حاصل کی لیکن روحانی طور پر آپکی تربیت قطب عالم عبد الخالق غجدوانی نے اویسی طریقہ پر فرمائی۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں میں اوائل احوال میں جذبات و بیقراری کے عالم میں راتوں کو اطراف بخارا میں پھرا کرتا تھا اور ہر مزار پر جاتا تھا۔ ایک رات میں تین مزارات پر گیا۔ آخر میں جس بزرگ کے مزار پر گیا وہاں حالت بے خودی میں میں نے دیکھا کہ قبلہ کی جانب سے دیوار شق ہو گئی اور ایک بڑا تخت ظاہر ہوا جس پر ایک بزرگ تشریف فرما تھے۔ الغرض ایک شخص نے مجھے بتایا کہ یہ عبد الخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ میں نے خواجہ کی خدمت میں سلام عرض کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیا اور وہ ارشادات فرمائے جو سلوک کے ابتدا اور درمیان وانتہا سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی مکمل سلوک کی تعلیم دیدی۔ اس موقع پر تاکیدی طور پر آپ نے مجھے ارشاد فرمایا استقامت سے شریعت کے شاہراہ پر چلنا۔ کبھی اس سے قدم باہر نہ نکالنا۔ عزیمت اور سنت پر عمل کرنا اور بدعت سے دور رہنا۔ اسی لیے مدت العمر آپ شریعت و سنت پر کاربند رہے اور اتباع شریعت اور رسم و بدعت سے نفرت طریقہ عالیہ نقشبندیہ کی امتیازی علامات ہیں۔ نقشبندی سلسلہ آپ کی طرف منسوب ہے۔ طریقہ عالیہ نقشبندیہ کی

تین اصطلاحات وقوف زمانی، وقوف عددی اور وقوف قلبی شاہ نقشبند قدس سرہ نے مقرر فرمائی ہیں اور آپ اویسی بھی ہیں کہ آپ کو روحانی نسب خواجہ عبدالخالق سے حاصل ہوئی۔ آپ کا وصال بروز پیر 3 ربیع الاول 791ھ مطابق 21 فروری 1390ء کو 73 برس کی عمر میں آبائی گاؤں قصر عارفاں میں ہوا۔ ان کی قبر پر ایک شاندار مزار تعمیر کیا گیا اور یہ بخارا کے قابل ذکر مقامات میں شامل ہے۔ مشہور یہ ہے کہ آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے جنازہ کے سامنے یہ شعر پڑھا جائے:

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو

شیئاللہ از جمال روئے تو

ترجمہ: میرے مولیٰ میں ایک مفلس کی حیثیت سے آپکی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں، خدارا اپنا جلوہ جہاں آرا مجھے دکھادے۔ یہ تمام حوالے درجہ ذیل کتابوں سے لیے گئے ہیں۔

- اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد 22 صفحہ 435 دانش گاہ پنجاب لاہور
- البینات شرح مکتوبات، محمد سعید احمد مجددی، جلد اول، صفحہ 285، تنظیم الاسلام پبلیکیشنز گوجرانوالہ"

جمعہ کی نماز ہم نے یہیں پڑھی اتنی بڑی مسجد میں بھی اندر جگہ نہیں مل سکی اس لیے باہر ہر طرف بچھی دبیز قالین پر کسی طرح جگہ مل گئی۔ جو اچھی بات یہاں نظر آئی وہ یہ کہ فرض نماز کے بعد جس طرح برصغیر میں لوگ جلدی جلدی مسجد سے بغیر سنت پڑھے نکل جاتے ہیں وہ یہاں نہیں دیکھا ایک بھی شخص بغیر سنن و نوافل ادا کیے مسجد سے باہر نہیں گیا۔ نماز کے بعد بہار نکلتے ہوئے دیکھا کہ کچھ خواتین گھروں سے سموسے بنا کر لائی تھیں جو نمازیوں میں تقسیم کر رہی تھیں۔ نماز سے قبل یہ بھی دیکھا کہ نمازیوں نے اپنے جوتوں کو جو بے ترتیب طریقے سے ادھر ادھر رکھا تھا کئی لوگوں نے ان تمام جوتوں کو سلیقے سے سیدھا کر کے رکھ دیا۔

ہم ان مقدس درباروں کی

حاضری کے بعد دوسرے دن حسب پروگرام مزید چار خواجگان کے مزارت کی زیارت کا شرف حاصل کیا ان میں حضرت خواجہ علی رومیتانی، حضرت خواجہ باباسماسی (جنہیں قطب عالم کہا جاتا ہے روحانی مرتبے میں آپ قطب کے مقام پر فائز تھے)، حضرت خواجہ سید امیر کالال یہ بزرگ حضرت بہاء الدین نقشبندی کے استاد تھے۔

دوسرے دن صبح سویرے ہم بخارا شہر دیکھنے نکلے۔ شام کو شادی تقریبات تھیں اس لیے وقت کم تھا اور قابل دید مقامات بہت تھے لہٰذا ہم

مخصوص مقامات کو ہی دیکھ سکے۔ لعبی حوض کے پاس ہم نے کار چھوڑ دی۔ سب سے پہلے ہم بخارا کے قدیمی علاقے کو دیکھنے گئے۔ دراصل یہ پُرانے گھر ہیں حکومت کی جانب سے یہاں مقیم لوگوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ ان گھروں کو توڑ کر نئے طرز کے مکانات تعمیر نہ کریں اس کے عوض انھیں حکومت کی جانب سے کئی طرح کی رعایتیں ملتی ہیں اسی لیے یہ تمام گھر بہت ہی پُرانے ہیں اور سب کے سب مٹی سے بنے ہیں۔ دیکھنے میں ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی گاؤں میں آگئے ہوں، گلیاں ویسے ہی شکستہ اور اندر کے راستے بالکل ویسے ہی محفوظ رکھے گئے ہیں۔ حکومت کی یہ قابل ستائش قدم ہے اس سے قدیم بخارا کی اصل تصویر دیکھنے کو ملتی ہے کہ اس زمانے میں بھی کیسے کیسے مکانات تعمیر ہوتے تھے۔ انھیں گلیوں کے درمیان ایک بزرگ کا مقبرہ بھی تھا۔ رمز الدین نے بتایا تھا کہ اسی پرانے مکانات کے درمیان ساتوں صدی ہجری کے ایک بہت بڑے بزرگ ہیں، مقامی لوگوں کو ت و معلوم ہے لیکن بیرونی افراد یہاں تک نہیں پہنچ پاتے اس لیے آپ ان بزرگ کے مزار کی ضرور زیارت

کریں، ان کا نام انھوں نے بندوق شاہ بتایا تھا۔ نام سننے میں ذرا تکلف ہوا کہ یہ جس وقت موجود تھے اس وقت بندوق تو موجود نہیں تھا تو ان کا نام بندوق شاہ کیسے ہوا؟ خیر ہم تلاش بسیار کے بعد وہاں پہنچ گئے ۔ دروازے نام 'حضرت پابند کشا' لکھا ہوا تھا، تب جا کر یہ عقدہ کھلا کہ بولنے میں یہ نام بگڑ کر بندق شاہ ہو گیا ہے۔ یہ مزار ایک مکان کے اندر ہے باہر سے بالکل نہیں لگتا کہ اس میں کوئی مزار بھی ہو گا کیونکہ یہ مکان اسی اصلی حالت میں برقرار رکھا گیا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ان بزرگ کا حجرہ تھا ان کی رحلت کے بعد یہیں ان کا مزار بنایا گیا ہے ۔ جب اس مکان کے اندر داخل ہوئی تو پہلے دو بزرگوں کے مزار تھے شاید یہ ان کی مریدین یا خلیفہ رہے ہوں گے۔ اس کے بعد اندر کمرے میں داخل ہوئے تو واقعی یہ ایک کمرہ ہی تھا وہاں دیوار سے متصل ان کی قبر تھی اور باقی کمرے میں قالین بچھی ہوئی تھی۔ زائرین آتے اور یہاں بھی حسب دستور اجتماعی فاتحہ ہوتا۔

اس کے بعد ہم بخارا میں اس مسجد کی دیکھنے گئے جس مسجد میں امام بخاری درس حدیث دیا کرتے تھے۔ اس پورے علاقے میں کئی مساجد اور مدرسے اور سرائے کی عمارتیں ہیں، لعبی حوض کے آاس پاس ہی ایک زرتشتوں کی عبادتگاہ بھی ہے جو اسی طرح محفوظ رکھی

گئی۔اس مسجد کو مسجد کلاں بھی کہا جاتا ہے ہم اس کے احاطے میں داخل ہوئے۔ یہاں کا سب سے بڑا مدرسہ میر عرب ہے جس کی تاریخ انتہائی قدیم ہے۔ آج بھی یہ مدسرہ موجود ہے اور اس میں تعلیم ہوتی ہے۔اس میں اسی زمانے کا قدیم ہاسٹل بھی اسی حالت میں موجود ہے جس وقت ہم وہاں پہنچے دور سی ہی قرآن پڑھنے کی آوازیں آرہی تھیں۔مدرسہ میر عرب حضرموت کے تاجروں نے قائم کیا تھا۔مدرسہ کے ساتھ ہی امام بخاری مسجد ہے جہاں امام بخاریؒ درس حدیث دیا کرتے تھے۔یہ اتنی بڑی مسجد ہے کہ اس میں 60 ہزار نمازی آرام سے نماز باجماعت ادا کر سکتے ہیں۔مسجد کلاں کے باہر بلند و بالا مینار ہے جس میں 148 سیڑھیاں ہیں۔گائیڈ نے بتایا کہ مینار کی تعمیر کے 2اسباب تھے پہلا سبب اس مینار سے موذن پانچ وقت اذان دیتا تھا جبکہ دوسرا سبب یہ مینار شہر کی حفاظت کے لئے اہمیت کا حامل تھا نگران ٹیمیں اس مینار پر ہمہ وقت موجود رہتی تھی جو کسی ناگہانی صورت میں نقاروں کے ذریعے باقی لوگوں کو خبردار کرتے۔مینار رات کو قافلوں کی رہنمائی کے لئے بھی

استعمال کیا جاتا۔ رات کے وقت مینار کی چوٹی پر مشعلیں روشن کر دی جاتی تھی جس کی روشنی دور سے دکھائی دیتی اور قافلے اس کی روشنی میں اپنی منزل کا اندازہ کرتے تھے۔ مسجد کلاں (بڑی مسجد) سے کچھ فاصلے پر امیر تیمور کے پوتے مرزا الوغ بیگ کا تعمیر کردہ مدرسہ بھی اپنی شان و شوکت کے ساتھ موجود ہے جس کی بناوٹ دیکھ کر اس وقت کے معماروں کی کمال مہارت کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ یہ تمام عمارتیں یونیسکو کی فہرست میں شامل ہیں۔ اس مسجد سے نکل کر کچھ ہی دوری پر گنبدوں والا بازار نظر آیا۔ اس زمانے میں اشیا کے لحاظ سے یہ گنبد بنائے گئے تھے مثلاً کسی گنبد کی دوکانوں میں کرنسی تبدیک کرنے کی دوکانیں اور کسی میں کپڑے اور کسی میں دیگر اجناس کی دوکانیں ہوا کرتی تھیں۔ آج بھی یہ بازار اسی شکل میں موجود ہے۔ کچھ ہی دوری پر امیر بخارا کا قلعہ تھا اس امیر بخارا کا محل آج بھی اسی شان و شوکت کی علامت ہے جو کبھی ماضی میں رہا ہو گا۔ محل کی فصیل بلند و بالا اور مرکزی دروازہ کئی میٹر اونچا ہے۔ محل میں داخل ہونے کے لئے ڈھلوان راستہ بنایا گیا ہے جس سے ہو کر محل کے مرکزی حصہ میں پہنچا جاتا ہے۔ محل کا

مرکزی ہال جہاں امیر بخارا کا دربار لگتا تھا بالکل وسط میں تھا ہال کے درمیان میں امیر بخارا کیلئے تخت لگایا جاتا تھا۔ محل میں مسجد ایک بلند

مقام پر تعمیر کی گئی تھی جو دور سے دکھائی دیتی تھی۔ دور سے دیکھنے پر یہ قلعہ مٹی کا نظر آتا ہے۔ مین گیٹ سے داخل ہوتے ہوئے دونوں جانب جیل کے کمرے بنے ہوئے تھے یہاں عارضی طور پر اہم قیدیوں کو رکھا جاتا ہے۔

شادی کی تقریبات اور کچھ نئی رسمیں

بخارا میں یہ حسن اتفاق تھا کہ شادی کی تقریب میں شامل ہوا اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ معاشرتی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ رسم و رواج میں بہت خرافات تو نہیں تھے اور نہ اصراف بیجا نظر آیا۔ مثلاً لڑکی والوں کو برصغیر میں جس طرح جہیز کے لیے پریشان ہونا پڑتا ہے ویسی لعنت وہاں ابھی تک موجود نہیں۔ کئی لوگوں سے اس سلسلے میں گفتگو کی سب نے یہی کہا لیکن یہ بھی بتایا کہ اب سوشل میڈیا کے سبب یا بدلتے زمانے کی وجہ سے تحائف دینے کا رواج شروع ہو گیا ہے۔ خیر جس دن صبح کو مرانہ پلاؤ کی دعوت تھی۔ پھر اسی دن شام کو دلہے کے گھر والے دلہے کے ساتھ گئے دلہن کے گھر گئے ۔ اب ضیافت کی ذمہ داری دلہن کے گھر والوں کی تھی ۔ ہم بھی اس قافلے میں شامل تھے ۔ کوئی شام کو پانچ بجے کا وقت ہوگا کہ ہم دلہن کے گھر پہنچے۔ اس رسم کو ایک طرح سے

بارات کہہ سکتے ہیں۔ اس بارات میں مشکل سے پندرہ سے بیس لوگ شامل تھے۔ جب بارات گھر کے قریب پہنچی تو ایک عجیب سی رسم دیکھنے کو ملی۔ دلہے ساتھ چند لڑکوں نے دو مشعلیں جلائیں۔ یہ مشعلیں بڑی سے لکڑی کی تھیں ان کی نوک پر تاروں سے دل کا نقشہ بنایا گیا تھا جسے روئی یا کپڑے سے لپیٹا گیا تھا اور اس میں ڈیزل یا کوئی اور تیل ڈال دیا گیا تھا تاکہ دیر تک مشعل روشن رہے۔ مشعل روشن ہوتے ہی

دف اور کچھ لاؤڈ موسیقی بھی شروع ہوگئی اور سارے لڑکے دلہے کے ارد گرد جمع ہوگئے اور زور زور سے ازبک زبان میں کچھ کہنے لگے، مجھے تو ایسا لگا جیسے نعرہ لگایا جارہا ہو، بعد میں جب پوچھا کہ اس کا کیا مطلب تھا؟ تو بتایا کہ ہم دلہن کے گھر والوں کو یہ بتارہے تھے کہ دلہا بہت اچھا ہے، آپ کا داماد سلامتی لے کر آیا ہے۔ خیر چند قدم کے فاصلے پر دلہن کے گھر کا دروازہ تھا جہاں پہلے سے ہی سوکھی لکڑیوں کو جمع کر کے رکھا گیا تھا۔ جیسے آلاؤ کے لیے ان لکڑیوں کو جمع کیا گیا ہو۔ دلہے کے ساتھیوں نے اس مشعل سے لکڑیوں میں آگ لگائی اس کے بعد لڑکے کو اس آگ کے گرد تین چکر لگوائے گئے۔ اسی درمیان دلہن کے گھر سے کچھ عورتیں نکلیں اور رقص کرتی ہوئی دولہے کا استقبال کیا۔ کچھ ہی دیر میں سارے مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بیٹھایا گیا۔ لڑکے کے لیے جگہ مخصوص تھی لیکن ان کو بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ مہمانوں کی ضیافت میں بہت زیادہ تکلفات نہیں تھے سادگی سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں پیش کی گئیں۔ بعد ازاں دلہے کو گھر اندر بلایا گیا۔ ہندوپاک میں ''دروازہ لگنے کی رسم'' ہوتی ہے اسی طرح کی یہ رسم تھی لیکن اس رسم کو دیکھ کر بہت اچھا لگا، دولہا جیسے ہی کمرے کے اندر داخل ہوئے دولہن کو ایک سرخ اوڑھنی میں سامنے لایا گیا اور آئینے کی مدد سے دولہن کو دیکھایا گیا۔ (ہندستان میں اس رسم کو آرسی مصحف کہا جاتا ہے) اس کے بعد ایک باحجاب اور معمر خاتون نے سلام پڑھنا شروع کیا جس میں رسول اکرم ﷺ آل محمد اور ازواج مطہرات پر سلام پیش کیا گیا۔ یہ سلسلہ دیر تک چلا۔ بس اتنی سی رسم تھی پھر دولہے صاحب ہمارے درمیان آکر بیٹھے اتنے میں واپسی کی تیاری ہونے لگی گویا دو گھنٹے ہم وہاں رکے اور دولہن کو لیے بغیر ہم واپس آگئے کیونکہ یہاں کی رسم کے مطابق دوسرے دن علی الصباح یہاں آکر دولہن کو لے جانا تھا۔

اس تقریب میں دولہے کی جانب سے جو لوگ شریک تھے وہ سب کے سب خاندان کے لوگ تھے اور دلہن کی جانب سے بھی صرف ان کے گھر والے تھے اس طرح بہت اژدہام نہیں تھا۔ میں چونکہ ایک غیر ملکی تھا اور ہندستان کی ایک بڑی یونیورسٹی میں پروفیسر تھا، یہ بات سب جانتے تھے اس لیے لوگوں نے میرا بڑا احترام کیا، بہت محبت سے پیش آئے اکثر معمر حضرات قریب آکر بیٹھتے اور زبان حال سے میرا استقبال کرتے، کچھ کہتے اور میں بھی کچھ کہتا نہ وہ میری بات سمجھتے اور نہ میں ان کی باتیں سمجھتا مگر محبت کی زبان ایسی ہوتی ہے کہ سب کچھ سمجھ میں آجاتا۔ ہاں ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جب ان کو معلوم ہوتا کہ میں مسلمان ہوں تو حیرت کرتے۔ مجھ سے پوچھتے آپ مسلمان ہیں؟ کئی بار تو دعا کے لیے مجھ سے کہا گیا تو میں نے دانستہ زور زور سے قرآنی آیات اور درود شریف پڑھا تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ میں مسلمان ہوں۔ لیکن ہر شخص میرے مسلمان ہونے پر حیرت کرتا جیسے ہندستان میں مسلمان ہوتے ہی نہیں ہیں۔ یہ بات صرف بخارا میں نہیں ہوئی بلکہ تاشقند میں بھی لوگ میرے مسلمان ہونے پر خوشی کا اظہار کرتے۔

شادی کے پروگرام کے مطابق دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد لڑکی کی رخصتی کے لیے جانا تھا لیکن میں بہت تھک گیا تھا اس لیے رات ہی معذرت کر لی تھی، تمام اہل خانہ سوائے میرے (میں سو رہا تھا اس لیے شاید باہر سے مین گیٹ پر یہ لوگ تالا لگا کر چلے گئے تھے) جب میں اٹھا تو ساری رسمیں ختم ہو چکی تھیں۔ لڑکی کے سسرال میں آنے کے بعد کی رسموں کی تفصیلات میں نے شاہ رخ سے معلوم کیں تو معلوم یہ ہوا کہ کہ آگ کے گرد تین چکر لڑکی کو بھی لینے ہوتے ہیں۔ یہ رسم بہت عجیب لگی۔ کئی پروفیسر ان سے میں نے دریافت کیا تو معلوم یہ ہوا کہ کہ زرتشتی عہد کی یہ رسم ہے جو معاشرتی رسم کے طور پر ادا کی جاتی ہے اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے لگا کہ بعض قومیں کس طرح اپنے اقدار کے دلدادہ ہوتی ہیں، جیسے جب مصر میں میرا قیام تھا تو وہاں کے لوگوں کو فرعونی تہذیب پر فخر کرتے ہوئے دیکھا تو حیرت ہوئی۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ سب فرعون ایسے نہ تھے کئی فراعین اہل توحید تھے اور مصر کی تہذیبی ترقی میں ان کا بڑا رول تھا اسی لیے وہ فرعونی تہذیب کی قدر کرتے ہیں۔ شاید یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہو۔

ازبکستان میں ایک بہت انوکھی چیز دیکھی اور بہت اچھا لگا کہ کاش ہمارے یہاں بھی ایسا ہو۔اس کے بارے میں ہمارے ایک ازبکی دوست نے کہا کہ جناب ازبکستان میں ہر شخص ٹیکسی ڈرائیور ہے۔مجھے یہ بات اس وقت سمجھ میں نہیں آئی مگر ایک دو دن دن میں جب اس کا مشاہد کیا تو بہت اچھا لگا۔دراصل یہاں پرائیوٹ ٹیکسیوں کا نظم بہت کم ہے۔جن کے پاس کار ہے وہ بغیر کسی تکلف کے راستے میں کسی بھی شخص کو بیٹھا لیتے ہیں اور ان سے کرایہ وصل کرتے ہیں۔ایسا کرنے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں وہ آفیسر بھی ہو سکتے ہیں یا عام بزنس مین یا کوئی بھی شخص۔اس رسم سے گاڑی چلانے والے شاید اپنے پیٹرول کا خرچ بھی نکال لیتے ہیں اور شاید کچھ بچ بھی جاتا ہو۔ایسا کرنا یہاں معیوب نہیں سمجھا جاتا۔اہم بات یہ بھی ہے کہ کہ ان پر سوار ہونے والے کوئی بھی ہو سکتے ہیں، لڑکیاں بھی ہوتی ہیں اور اسی مغربی لباس میں لیکن آج تک کسی بد تمیزی یا کرائم کی کوئی رپورٹ درج نہیں ہوئی ہے۔ویسے ازبکستان میں کرائم ہی کم ہے اور خاص طور پر لڑکیوں کے حوالے سے کرائم نا کے برابر ہے۔اسی طرح اس ملک کے لوگ وہی بولتے ہیں جو دل میں ہوتا ہے،ان سے اگر مذاق میں بھی کوئی بات کہہ دی تو وہ اسے سچ مان لیتے ہیں، جھوٹ بہت کم بولتے ہیں ازبکستان والوں کی ایک دو اچھی عادتوں کا ذکر کرتا چلوں۔جب بھی کوئی کسی قبرستان کے سامنے سے گرزتا ہے تو دعا کے لیے ہاتھوں کو بلند کرتا ہے اور مرحومین کے لیے دعا کرتا ہے۔یہ اور اس کے علاوہ بھی کئی عادتیں اس ملک کو امن وامان فراہم کرتی ہیں۔ویسے عالمی سروے کے اعتبار سے ازبکستان خوش رہنے والے ممالک میں 44 نمبر پر آتا ہے۔واقعی میں یہاں کے لوگوں کو بہت سنجیدہ اور خوش وخرم دیکھا۔

ہوس گروہی گروپ

شام کو ولیمہ کا پروگرام تھا یہ تقریب شہر کے ایک شادی ہال میں تھی اس تقریب میں شرکت کے لیے ازبکستان میں یہ ایک فیملی میوزیک گروپ ہے اس گروپ میں بھائی بہن اور والد سب کے سب ایک ہی فیملی سے ہیں ان کے والد کا نام رستم ہے جو ان بچوں کی کافی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔یہ گروپ ''ہوس گروہی'' کے نام سے جانا جاتا ہے ازبکستان میں 'ہوس' کا لفظی معنی آرزو کے ہیں۔یہ کافی مقبول گروپ ہے ان کی ایک خاصیت یہ ہے

کہ یہ ہندستانی فلمی نغموں کو بہت خوبصورتی سے گاتے ہیں جبکہ یہ اردو ہندی نہ بول پاتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں مگر جس خوبصورتی سے الفاظ اور لہجے کی ادائیگی کرتے ہیں وہ قابل داد ہے۔یہ حسن اتفاق ہے کہ ہم اس تقریب کے لیے ایک ہی مہمان خانے میں رکے۔یہ گروپ ہندستان میں بھی کافی مقبول ہیں میں بھی اس گروپ سے۔ واقف تھااس لیے جب ان سے غیر متوقع طور پر ملاقات ہوئی اور ساتھ رہنے کا موقع ملا تو انتہائی خوشی ہوئی۔رستم صاحب اور ان کے بڑے صاحب زادے چونکہ انگریزی میں بات کر سکتے تھے اس لیے بہت آسانی ہوئی۔

سات بجے شام سے کچھ پہلے ہم ہال میں پہنچ گئے، آہستہ آہستہ مہمانوں کی آمد شروع ہوئی۔ یہاں بھی مہمانوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی۔ہال بہت سلیقے سے سجا ہوا تھااور ہر طرف گول میز لگی ہوئی تھی، ہر میز کے ساتھ آٹھ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ہر میز پر انواع وقسام کے کھانے پینے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ہال کے ایک جانب دولہا دلہن کے لیے اسٹیج بنا ہوا تھااور اسی کے سامنے دوسری جانب میوزک کے پروگرام کے لیے اسٹیج سجا تھا۔دولہا دلہن کے آنے سے قبل ہی میوزک کا پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ٹھیک سات بجے بہت ہی شاہانہ انداز میں دولہا دلہن کی ہال میں آمد ہوتی ہے۔گیٹ پر ان دونوں کا شاندار استقبال کیا گیا اس کے بعد جب یہ ہال میں داخل ہوئے تو ہر دو تین قدم پر رک رک کر دلہن حاضرین کے استقبال کے لیے کورنش بجالاتی اس طرح اسٹیج

تک آنے میں انہیں تقریباً آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ اسٹیج پر آنے کے بعد بھی دلہن مستقل جھک جھک کر سلام پیش کرتی رہی ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی گڑیا میں چابھی بھر دی گئی ہو اس لیے وہ مستقل ایک ہی انداز میں جھکی جا رہی ہو۔ مجھے عجیب لگا کہ کہ سب لوگ بیٹھ چکے تھے مگر دلہن بھاری بھر کم لباس میں کیسے یہ تکلیف برداشت کر رہی یہ دیکھ کر اچھا نہیں لگا۔ میں نے دلہے کے بھائی سے کئی بار کہا بھی کہ اب دونوں کو بیٹھ جانا چاہیے مگر انھوں نے بتایا کہ یہی رسم ہے۔ اس طرح تقریباً دو گھنٹے تک یہی سلسلہ رہا ہو گا۔ خیر اس درمیان سب سے پہلے یہ رسم ہوئی کہ دولہے اور دلہن کے والد اسٹیج کے سامنے کھڑے ہوئے ان کے ہاتھ میں مائیک دیا گیا اور دونوں نے نئے جوڑے کو شادی کی مبارکباد دی۔ اس کے بعد دونوں کی والدہ آئیں لڑکی کی والدہ شاید زیادہ شرمیلی تھیں اس لیے انھوں نے کچھ نہیں کہا مگر دولہے کی والدہ نے کچھ دیر تک گفتگو کی، ساری محفل واہ واہ کہہ رہی تھی مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا مگر ان کی گفتگو کے انداز سے معلوم ہوا کہ وہ کافی جذباتی ہو گئیں تھیں۔ اس کے بعد خاص رشتہ داروں نے مبارکبادیاں دیں۔ مجھے بھی مبارکباد دینے کے لیے بلایا گیا میں نے اپنی اور ہندستان کی جانب سے ان کو مبارکباد پیش کی، شاہ رخ نے میری مبارکبادی کا ازبک میں ترجمہ کیا۔ خیر اب محفل شباب پر آ رہی تھی موسیقی کا پروگرام محفل کو خوشگوار بنا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب ہوس گروہی گروپ کا میوزک شروع ہوا اور انھوں نے ہندستانی فلموں کے نغمے گانے شروع کیے تو پوری محفل جھوم اٹھی، عورت مرد سب رقص کرنے لگے۔ مجھے ایسا لگا کہ رقص کی عادت یہاں عام ہے خوشی کی تقریبات میں عام طور پر رقص ہوتا ہے لیکن شائستگی کے ساتھ۔ یہی چیز میں قاہرہ میں بھی دیکھی تھی۔ مجھے چونکہ رات کے نو بجے کی ٹرین سے تاشقند کے لیے روانہ ہونا تھا اس لیے ہم ساڑھے آٹھ بجے اہل خانہ سے اجازت لے کر نکل آئے حالانکہ وہ اجازت دینے کے موڈ میں نہیں تھے کیونکہ ابھی تو محفل ختم بھی نہیں ہوئی تھی۔ بہر کیف ان کی بہت ساری محبتیں اور دعائیں لے کر ہم بخارا اسٹیشن وقت پر پہنچ گئے۔ اس یادگار سفر کے لیے میں محترمہ لولا صاحبہ، جناب عزیز الدین صاحب، رمز الدین ان کے والد، والدہ، ہمشیرہ اور بھائی کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں۔

تاشقند واپسی

رات بھر کے سفر کے بعد پانچ مئی کی صبح تاشقند آگیا یہ اتوار کا دن تھا چھٹی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ کے طلبہ و طالبات نے کئی بار یہ گزارش کی تھی کہ ہمارے ساتھ تاشقند کے مضافات میں پہاڑوں کی سیر کے لیے چلیں۔ یہ دن اچھا تھا کیونکہ سوموار سے رمضان شروع ہونے والا تھا اور روزے کی حالت میں گھومنا شاید مشکل ہو اس لیے سمندر کو فون پر اپنی آمد کی اطلاع دی انھوں نے کئی دوستوں سے بات کی اور بیلدر سائے جو تاشقند سے تقریباً 70 کیلو میٹر

کی دوری پر خوبصورت پہاڑ ہے جہاں چھٹیوں کے دنوں میں تاشقند والے سیر کے لیے نکل جاتے ہیں، اس مقام پر جانے کا فیصلہ ہوا۔ دہلی سے ڈاکٹر اخلاق بھی تاشقند آچکے تھے ان کا بھی اسی گیسٹ ہاؤس میں قیام تھا۔ ناشتے پر ان سے ملاقات ہوئی تو وہ بھی ساتھ جانے کو تیار ہوگئے۔ ہمارے ساتھ سمندر، دلآرام رہبر کے طور پر تھے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت طے کر کے خوشگوار وادی میں پہنچ گئے۔ اس کے سرسبز و شادب نشیب و فراز انتہائی دلکش تھے ساتھ میں چرچیک ندی کا کنارا دلفریب تھا۔ کئی گھنٹے گزارنے کے بعد ہم شام گئے تک گیسٹ ہاؤس آئے۔

اگلے دن تاشقند میں پہلا روزہ تھا، جب کلاس روم گیا تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تمام طلبہ و طالبات روزے سے ہیں، یہاں کی نئی نسل کو دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ سب روزہ دار ہیں۔ ان کے ملبوسات میں اگرچہ روسی جھلک موجود ہے اور بہت حد تک ان کی طرز حیات میں مغربیت نظر آتی ہے مگر ان کے قلوب ایمان سے منور ہیں. اللہ

اس ملک کو اور اس ملک کے لوگوں کو فلاح دارین عطا کرے۔

دوسرے رمضان کو اورینٹل اسٹڈیز، تاشقند کے ہمارے عزیز طالب علموں نے الوداعی افطار کا اہتمام کیا یہ پہلی جماعت کے طالب علم تھے انہیں معلوم تھا کہ 11 مئی کو ہماری واپسی ہے۔ یہ بڑے اہتمام سے افطار کا انتظام کرنے والے تھے مگر ہر دن افطار کی دعوت کی وجہ سے ہم مصروف تھے اس لیے یہی ایک دن بچا تھا اس لیے جلدی بازی میں دوپہر کو انھوں نے افطار کی تیاری شروع کی اور شہر کے مشہور ریسٹورینٹ الہلال میں یہ اہتمام ہوا۔ میری خوشی، میری حیرت کی انتہا نہیں کہ یہ بچے مجھ سے اس قدر پیار کرتے ہیں۔ ان کے اندر علم حاصل کرنے کا جذبہ لائق تحسین ہے۔ سب روزہ دار ہیں اور دلوں میں ایمان کی روشنی ہے۔۔ اللہ ان بچوں کو دونوں جہاں میں کامیابیاں عطا کرے۔

8 مئی کو انسٹی ٹیوٹ میں ایک تقریب رکھی گئی۔ یہ تقریب ایک تو ہماری الوداعی تقریب تھی اور دوسرا اس میں ہماری اور ڈاکٹر محیا عبد الرحمانوا کی مشترکہ تصنیف ''اردو شاعری'' کی رسم اجرا بھی تھی۔ تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے اساتذہ کا تہہ دل سے شکریہ کہ انھوں نے میرے لیے الوداعی تقریب کا اہتمام کیا اور مجھے اعزاز سے نوازا۔ صدر شعبہ پروفیسر الفت محب صاحبہ اور لولا مکتوبہ صاحبہ جو بہت ہی دل سے تمام انتظامات کرتی ہیں، محیا عبد الرحمانوا اور شعبے کے تمام

اساتذہ کا اس عزت افزائی کے لیے ممنونیت کا اظہار کرتا ہوں۔ مجھے اس تقریب میں توصیفی سند اور تاشقند کا تحفہ دیا گیا۔ اس تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر لال بہادر شاستری سینٹر فار انڈین کلچر کے ڈائریکٹر پروفیسر چندر شیکھر صاحب اور صدر کی حیثیت سے جناب نادر عبداللہ ایوپر وائس چانسلر تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ فار اورینٹل اسٹڈیز، موجود تھے۔ ان کے علاوہ طلبہ وطالبات نے بھی شرکت کی۔

اخبارت میں جو رپورٹ شائع ہوئی ہے وہ اس طرح ہے۔

تاشقند میں پروفیسر خواجہ اکرام الدین کی کتاب کی رسم اجرا

تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ فار اورینٹل اسٹڈیز، تاشقند ازبکستان میں ایک پر وقار تقریب میں پروفیسر خواجہ اکرام الدین اور ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا، استاد اورینٹل اسٹڈیز تاشقند کی مشترکہ تصنیف ''اردو شاعری'' کی رسم اجرا ہوئی۔ خواجہ اکرام وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے ان دنوں تاشقند میں ہیں۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی فرمائش پر یہ کتاب یہاں کے طلبہ وطالبات کے لیے لکھی گئی ہے، جو شامل نصاب

ہوگی۔ اس تقریب کے موقعے سے تاشقند اسیٹ انسٹی ٹیوٹ فار اورینٹل اسٹڈیز، تاشقند کے تمام اساتذہ موجود تھے اور مہمان خصوصی کے طور پر لال بہادر شاستری سینٹر فار انڈین کلچر کے ڈائریکٹر پروفیسر چندر شیکھر صاحب اور صدر کی حیثیت سے نادر عبداللہ ایوپر وائس چانسلر تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ فار اورینٹل اسٹڈیز، تاشقند موجود تھے۔ شعبے کی صدر پروفیسر الف محب صاحبہ نے اپنی افتتاحیہ تقریب میں مہمانوں کا استقبال کیا اور پروفیسر خواجہ اکرام کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جس طرح انھوں نے نئیٹکنالوجی کی مدد سے ہمارے طالب علموں کو پڑھایا وہ ہمیشہ یاد کیا جائے گا، ان کی آمد سے ہمارے طالب علموں میں نئی جان آگئی اس کے علاوہ ہمارے شعبے کے لیے اس کتاب کی تصنیف بھی ایک ناقابل فراموش خدمت ہے۔ اس کے بعد پروفیسر چندر شیکھر نے ہندستان اور ازبکستان کے تعلقات اور زبانوں کے رشتوں پر وضاحت سے روشنی ڈالی۔ پرو وائس چانسلر نے شعبے کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ہندستانی پروفیسر خواجہ اکرام کا شکریہ ادا کیا اور ایک تہنیت نامہ پیش کیا۔

اس موقعے پر پروفیسر خواجہ اکرام نے انسٹیٹیوٹ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے مدعو کر کے یہاں کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات سے ملنے کا موقع دیا۔ انھوں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا کہ زبان کو سیکھانے میں یہاں کے اساتذہ بہت محنت کرتے ہیں اسی لیے صرف پانچ چھ مہینے کی مختصر مدت میں یہ اردو ہندی بولنے لگتے ہیں۔ خواجہ اکرام صاحب نے خاص طور الفت صاحبہ، محیا صاحبہ اور لولا مکتبہ صاحبہ کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے ہر طرح سے اس سفر میں میرا ساتھ دیا۔

لال بہادر شاستری سینٹر فار انڈین کلچر میں لیکچر

اسی شام کو پروفیسر چندر شیکھر، ڈائریکٹر لال بہادر شاستری سینٹر فار انڈین کلچر نے میرے لیکچر کا اہتمام کیا۔ عنوان 'ہندستان اور ازبکستان کے تہذیبی روابط' تھا۔

لیکچر سے قبل ازبکی لڑکیوں نے ہندستانی رقص پیش کیا، ہندی نغمے سنائے اس کے بعد پروفیسر بیات کی تقریر ہوئی اور آخر میں میری تقریر ہوئی، صف سامعین میں سب کے سب ازبکی تھے اس لیے میری تقریر کا ترجمہ ڈاکٹر محیا صاحبہ نے کیا۔ ایک گھنٹے کی اس

تقریب کے بعد بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور یہیں طے ہوا کہ اگلے دن پروفیسر چندر شیکھر کے گھر افطار کی دعوت پر جانا ہے۔

پروفیسر چندر شیکھر کے گھر افطار کی دعوت

چندر شیکھر صاحب اکیلے گھر میں ہوتے ہیں لیکن گھر اتنا بڑا ہے کہ کئی فیملی ایک ساتھ رہ سکتی ہے۔ان کے لیے یہ مشکل کام تھا کہ افطار کا کیسے انتظام ہو مگر انھوں نے بہت سے کھانے خود اپنے ہاتھوں سے بنائے، کچھ کی ذمہ داری لولا صاحبہ نے لی۔ یہاں آکر پتہ ہی

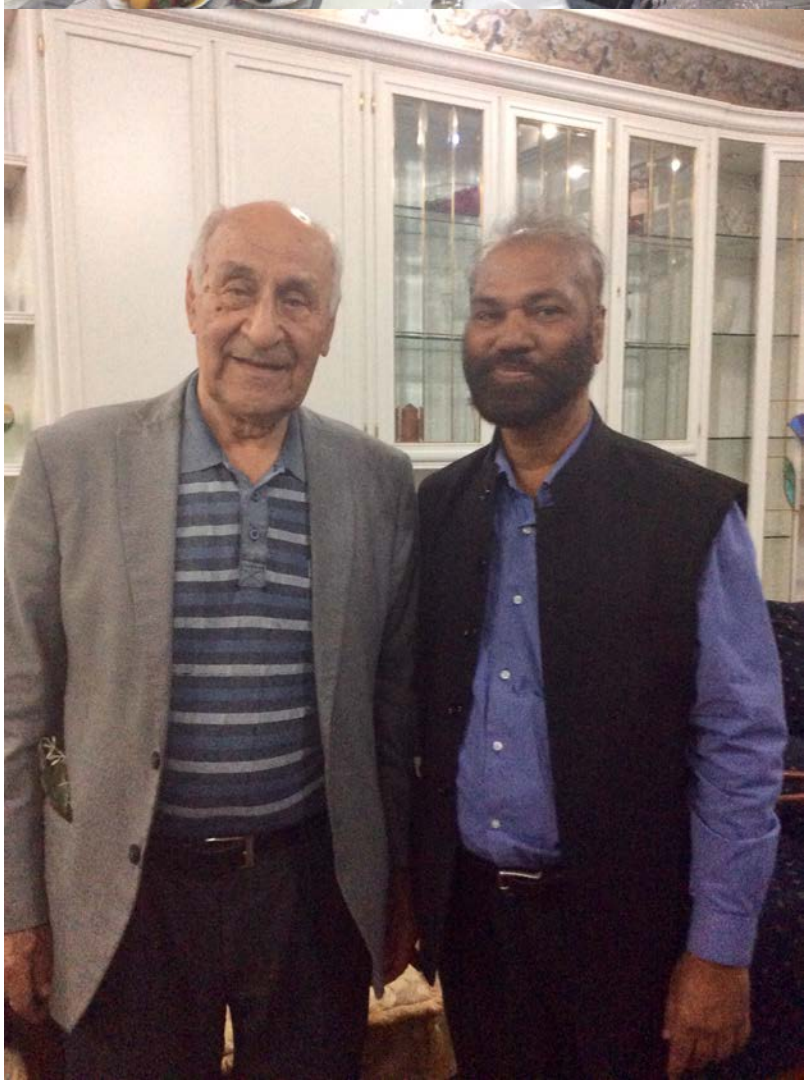

نہیں چلا کہ میزبان کون ہے اور مہمان کون ہے۔ کیونکہ خواتین نے کیچن سنبھال لیا۔اس دعوت کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں انسٹی ٹیوٹ کے تمام اساتذہ مدعو تھے اور تاشقند میں اردو کے بڑے نامور ادیب تاش مرزا صاحب بھی مدعو تھے، ان سے ملاقات کا یہی بہتر موقع تھا۔

ازبکستان کے 'شہر امن' تاشقند میں اردو کے بنیاد گزاروں میں جناب تاش مرزا خالمرزائی کا نام بہت ہی اہم ہے وہ ساٹھ کی دہائی میں دو ساتھیوں کے ساتھ اردو زبان کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی یونیورسٹی جانے والے پہلے طالب علم

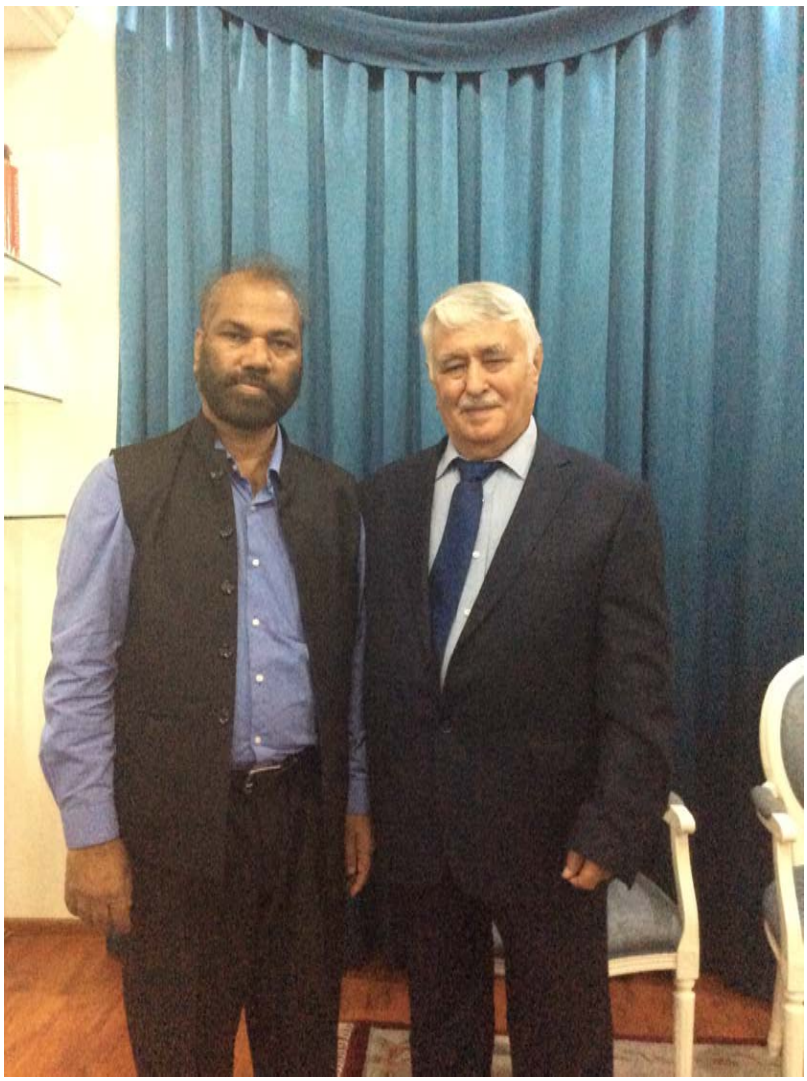

تھے جو اردو زبان سیکھنے کے لیے ہندستان گئے۔ اس وقت خواجہ احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی کے صدر تھے۔وہاں سے آنے کے بعد ان کے بازؤں میں جیسے شاہین کے پر لگ گئے اور بتدریج اردو زبان و ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔اردو زبان کے لیے ان کی خدمات بہت ہیں یہ اور بات ہے کہ بر صغیر میں کہیں بھی ان کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا یہ ہم اردو والوں پر ایک قرض ہے۔تاش مرزا صاحب کی طرح اور بھی کئی شخصیات ہیں جن کی بدولت ازبکستان میں اردو والوں کی آج بڑی تعداد موجود ہے۔ان شاءاللہ بہت جلد ان پر تفصیلی مضمون لکھوں گا تا کہ اہل اردو ان کی خدمات سے متعارف ہو سکیں۔آج کی شام ان سے ملاقات میرے لیے ایک تاریخی دن کی حیثیت رکھتا ہے۔اتنے معمر ہونے کے باوجود انتہائی زندہ دل اور جوش و خروش سے ملنے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ نفیس اردو میں ایسی باتیں کرتے ہیں کہ بس سنے جایئے۔ان کی گفتگو میں مزاح کا پہلو حاوی ہوتا ہے۔بہت کم وقت ملا ان سے بات کرنے کا لیکن یہ تین گھنٹے یادگار رہے۔اللہ انھیں صحت و سلامتی کے ساتھ رکھے۔اسی محفل میں جناب داداخان نوری صاحب سے خوشگوار ملاقات ہوئی۔تاشقند میں فیض احمد فیض نے ان کے گھر قیام کیا تھا۔فیض شناسی کے حوالے سے ان کی شخصیت بہت اہم کیونکہ تاشقند میں فیض کے قیام کے حوالے سے اب تک بہت سے پہلو اخفائے راز میں ہیں۔داداخان صاحب نے ہندستانی نغموں کی دلکشی سے اردو ہندی خود سے سیکھی بعد میں قمر رئیس صاحب نے ان کی اردو کو جلا بخشی،اب تک ان کی کئی تحریریں منظر عام پر آچکی ہیں۔ان کے علاوہ اور بھی کئی اہم شخصیات اس افطار میں موجود تھیں۔جناب چندر شیکھر صاحب کا اس لیے میں بہت شکریہ ادا کرتا ہوں کہ کہ افطار کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان اہم شخصیات سے ملاقات کا موقع فراہم کیا۔

11 مئی کی صبح گیارہ بجے کی فلائٹ تھی اس لیے ہم گیسٹ ہاؤس سے سات بجے ہی نکل گئے۔ ڈاکٹر محیا صاحبہ کے ایک طالب علم جمشید اپنی گاڑی سے مجھے ائیر پورٹ لائے یہاں محیا صاحبہ پہلے سے منتظر تھیں۔ ائیر پورٹ میں ان کی ایک شاگردہ کام کرتی تھیں، انھوں نے انھیں فون کیا اور خود میرے ساتھ اندر تک آئیں، میرے ساتھ مشکل یہ تھی کہ سامان بہت زیادہ تھا اور صرف بیس کیلو لے جانے کی اجازت تھی لیکن ان کی شاگردہ زلفی صاحبہ کی وجہ سے یہ مشکل بھی آسان ہوئی۔ دراصل دہلی ائیر پورٹ میں پہلی دفعہ ایسا تجربہ ہوا تھا کہ بورڈنگ شروع ہونے کے بعد عجیب واقعہ ہوا۔ خود پائلٹ بورڈنگ گیٹ پر موجود تھے اور بہت سختی سے لوگوں کے ہینڈ بیگیج چیک کر رہے تھے کہ سات کیلو سے زیادہ نہ ہو۔ اس وجہ سے بورڈنگ میں بہت تاخیر بھی ہوئی۔ میری مشکل یہ تھی کہ ہینڈ بیگ میں بہت ساری کتابیں تھیں جس کا وزن دس کیلو سے زیادہ تھا۔ لیکن شکر ہے کہ ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ تاشقند سے واپسی پر بھی میرے ہینڈ بیگ کا وزن زیادہ ہی تھا مگر زلفی صاحبہ کی وجہ سے سب مرحلے آسانی سے طے ہوئے اور یہاں دہلی کی طرح بورڈنگ گیٹ پر وہ تماشہ بھی نہیں تھا۔

پندرہ دنوں کے طویل سفر کے بعد ان تمام ناقابل فراموش اور خوشگوار یادوں کے ساتھ 11 مئی کو دہلی واپس آگیا۔

چند یادگار تصویریں

***